مختلف مضامین

قرآنی سیریز - ۳

علّامہ نصیرالدّین نصیر ہونزائی
کے ٹرانسکرائب لیکچرز

تمہید

استادِ بزرگوار علامہ صاحب ق‌س نے اپنی صد سالہ عمرِ گرانمایہ میں اپنی زبانِ فیض بار اور قلمِ جواہر نگار سے کتابوں کے علاوہ آڈیو لیکچرز کی صورت میں ایک بیش بہا خزانہ عالمِ انسانیت کے لئے عطا کیا ہے۔ اِن لیکچرز کی اہمیت کے حوالے سے آنجناب خود فرماتے ہیں:

''ہمارے کیسٹوں میں جو تقاریر ہیں وہ بنیادی اور اساسی مواد کا کام دیں گے، یعنی اُن سے اسماعیلی مذہب پر ریسرچ میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ میرے نزدیک ہر کیسٹ کا مواد ایک کتابچہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں بڑی اہم باتیں ریکارڈ ہوئی ہیں۔ کیسٹوں کے قیمتی مواد کو محفوظ کر لینا ضروری ہے، کیونکہ یہ ہماری پیاری جمعیت کی دولت ہے، یہ ہمارے علمی سرمایے کا ایک اہم حصّہ ہے، اور ہم کو یقین ہے کہ مستقبل میں ہمارے ان علمی کاموں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہونے والا ہے، ہماری تحریروں کے ایک ایک پُرزے پر ریسرچ ہوگی، کیونکہ ہماری نگارشات میں امامِ عالیمقامؑ کی نورانیت و روحانیت براہِ راست کارفرما ہے''۔ (غیر مطبوعہ)

استادِ گرامی ق‌س کی اِس روشن ہدایت کے پیشِ نظر اِن گرانمایہ دُرّ و مرجان کو ضبطِ تحریر میں لانے کا انتہائی اہم اور دقیق کام استاد بحر العلوم صاحب کی سرپرستی میں شروع کیا گیا ہے۔ اور آپ نے اِس سلسلے میں خانۂ حکمت کے تمام سینٹرز میں جا کر اس کام کی اہمیت کے حوالے سے آگاہی اور رہنمائی فرمائی ہے اور ناچیز کو اِن لیکچرز کو تحریر میں لانے اور منظم کرنے کی ذمہ داری دی ہے اس سلسلے میں کئی احباب انتہائی جانفشانی سے کام کر رہے ہیں۔ ان خزائن کو جماعت اور دنیائے انسانیت تک پہنچانے کے لئے محترم مصطفیٰ مومن صاحب نے اسے (ebook) کی صورت میں پیش کرنے میں ہماری مدد فرمائی ہے۔

ناچیز نسرین اکبر

قرآنی سیریز ۔ ۳

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	لیکچر نمبر	صفحہ نمبر
۱	سورۂ ملک (۶۷) کی تاویلی حکمتیں	ق- ۲۱	۱
۲	قرآن کے مطالب کو سمجھنا	ق- ۲۲	۹
۳	سورۂ ماعون (۱۰۷) کی تاویل، یتیم کی حکمت، سورۂ جنّ (۷۲) کی حکمتیں	ق- ۲۳	۱۵
۴	سورۂ تحریم کی چند حکمتیں۔ اصل میں واصل ہو جانا	ق- ۲۴	۲۴
۵	سورۂ لقمان کی حکمتیں	ق- ۲۵	۳۶
۶	قرآن کے مراکز۔ گوہرِ عقل	ق- ۲۶	۴۷
۷	سورۂ الصّٰفّٰت	ق- ۲۷	۶۲
۸	سورۂ قیامت کی چند حکمتیں (از کتاب قرۃ العین، ص۔ ۵۲)	ق- ۲۸	۷۷
۹	سورۂ جمعہ کی حکمتیں	ق- ۲۹	۸۸
۱۰	قرآن میں بابِ صغیر کا تصوّر	ق- ۳۰	۹۸

Click here
for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان
عنوان: سورۂ مُلک (۶۷) کی تاویلی حکمتیں

کیسٹ نمبر: Q-21 تاریخ: ۲۹ رجون ر ۱۹۸۲ء کراچی

[اِس] پاکیزہ کلاس میں سورۂ ملک کے بارے میں کچھ تاویلی حکمتیں بیان کرنے کے لئے کوشش کریں گے اور اُس روز میں نے کچھ سوالات بنائے تھے، وہ شاید آپ عزیزوں کے سامنے پڑھے بھی گئے ہیں، میں اُن کو درمیان میں دُھرانے کے لئے بھی کوشش کروں گا یا یہ کہ اُن کو (cover) کروں گا، تو سب سے پہلے بات یہ ہے کہ سورۂ ملک کی اہمیت کیا ہے؟ عرض ہے، کہ سورۂ ملک کئی مواقع پر پڑھی جاتی ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ کسی بھی سورے کی تلاوت کی اہمیت اِس لئے ہے، کہ اُس کے اندر کچھ اسرارِ خداوندی پوشیدہ ہیں۔ اب ہم یہ کوشش کرتے ہیں، کہ اِس پاک سورے کے باطن میں کون کون سی ایسی حکمتیں ہیں جن کو ہم سمجھ سکتے ہیں۔

سب سے پہلے یہاں برکت کا ذکر ہوا ہے اور برکت ایک اہم قرآنی اور اسلامی لفظ ہے۔ برکت ہر قسم کی ہے، مثلاً رزق و روزی میں برکت، کسب و کمائی میں برکت، علم و ہنر میں برکت اور جسم و جان میں برکت، اولاد میں برکت وغیرہ۔ یہاں پر لفظِ برکت ذاتِ خدا سے متعلق ہے اور ارشاد اِس طرح سے ہے کہ: "تَبَارَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ۖ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" (۶۷:۱) وہ خدا جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے بڑی برکت والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اِس میں سب سے پہلے برکت کا جو تعلق ہے وہ خداوندِ عالم کی خدائی میں جو کچھ بھی ہے خواہ وہ صفاتِ خداوندی ہیں، خواہ وہ اُس کے وہ انعامات ہیں جو اُس کی مخلوق کے لئے ہیں [سے ہے] وہ ساری چیزیں اِس لفظِ برکت میں آتی ہیں اور اللہ کا یہ فرمانا کہ بادشاہی اُس کے ہاتھ میں ہے اور وہ بڑی برکت والا ہے تو اب اِس کا اشارہ بادشاہی کی طرف جاتا ہے۔ یعنی خدا کی بادشاہی ایسی ہے کہ وہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور اُس خدا کے ہاتھ میں جو بڑی برکت والا ہے، تو اِس کا پورا مفہوم یہ بنتا ہے کہ خدا کی بادشاہی کی چیزیں لاانتہا ہیں یعنی اُس کی بادشاہی میں ایسی ایسی برکتیں ہیں کہ وہ کبھی ختم نہیں ہوتیں، اِس لئے خدا کی بادشاہی لازوال ہے اور دُوسرا نکتہ اِس میں یہ ہے، کہ خدا کے ہاتھ میں بادشاہی ہے، تو یہ اشارہ ہے کہ خدا کی بادشاہی پیغمبر اور امامؑ کے ہاتھ میں ہے، اِس لئے کہ جب ہم شریعت کی سطح پر بات کرنے بیٹھتے ہیں، تو اُس وقت تاویل کے بغیر خدا کے مادّی ہاتھ کا تصوّر نہیں بنتا ہے۔ جیسا کہ آیۂ بیعت میں آنحضرتؐ کے ہاتھ کو اللہ کا ہاتھ قرار دیا گیا ہے (۴۸:۱۰) اِسی طرح

جہاں کہیں خدا کے ہاتھ کا ذکر آتا ہے تو اُس کی تاویل یا تو عقلِ کُل اور نفسِ کُل ہوتی ہے یا ناطق اور اساس۔ قرآنِ مقدّس کی ایک آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ: "بَلْ یَدَاہُ مَبْسُوْطَتَانِ" (۵:۶۴) بلکہ اُس کے دونوں ہاتھ بہت بسیط ہیں یعنی ہمہ رَس ہیں، تو اِس مقام پر عقلِ کُل اور نفسِ کُل مراد ہیں۔ اِسی طرح خدا کے دائیں ہاتھ پیغمبر ہیں اور بائیں ہاتھ امام ہیں، دائیں کی تاویل ظاہر ہے اور بائیں کی تاویل باطن، کیونکہ ناطق ظاہر ہے اور اساس کا درجہ باطن ہے۔ اب اِس مقام پر ملک یعنی بادشاہی کے بارے میں مزید وضاحت کرتے ہیں، کہ ملک کا مطلب بادشاہی ہے اور خدا کی بادشاہی کا دُوسرا لفظ خدائی یا خداوندی ہے، اِس کے یہ معنی ہوئے، کہ خدا کی خداوندی یا بادشاہی اُس کے نور میں ہے، اور یہ تصوّر بالکل صحیح ہے کیونکہ خدا کی صفات جتنی بھی ہیں وہ اُس کے نور میں ہیں اور خدا موصوف نہیں۔

اِس کے بعد ہم دوسری آیت میں جاتے ہیں جس کا ارشاد ہے۔ کہ: [اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۚ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ] اُسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں، کون اچھے کام کرتا ہے اور وہ زبردست اور بخشنے والا ہے (۶۷:۲)۔ یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے جس طرح زندگی کو پیدا کیا وہ تو بات واضح ہے لیکن یہ بات فوری طور پر ایک سوال کی حیثیت رکھتی ہے، کہ خدا نے کس طرح موت کو پیدا کیا جبکہ موت نیستی کا نام ہے یعنی وہ کچھ بھی نہیں، تو تخلیق کا نام اِس پر کس طرح واقع ہوتا ہے یا کہ تخلیق کا اطلاق کس طرح ہوسکتا ہے؟ اِس کا جواب یوں ہے کہ اللہ نے دو قسم کے انسانوں کو پیدا کیا، ایک قسم صحیح معنوں میں خلق ہے یعنی مخلوق اور دُوسری قسم موت کے برابر ہے۔ چنانچہ قرآن میں ایسی کئی آیات ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ زندہ تو ہیں مگر بحقیقت زندہ نہیں (۷:۱۷۹)۔ اِس لئے خداوندِ عالم نے اُن کو موت قرار دیا ہے یعنی حیات یا کہ زندگی خدا کی نظر میں ایک حقیقی رُوح کا نام ہے۔ وہ ہو تو حیات ہے، وہ ایمانی رُوح ہے، رُوح الایمان، اگر رُوح الایمان نہیں ہے صرف حس و حرکت والی رُوح ہے، تو وہ سچے دین میں زندگی کے نام کی حقدار نہیں۔ اِسی کے ساتھ جو فرمایا گیا کہ اللہ اِس میں تمہیں آزمانا چاہتا ہے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے، اِس کا مطلب یہ ہے کہ خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اِس بات کو اِس راز کو کون جانتا ہے اور حقیقی رُوح اور حیوانی رُوح کے درمیان جو فرق ہے اُس کو کون سمجھتا ہے۔

اِس کے بعد تیسری آیت میں جاتے ہیں جس میں ارشاد ہے کہ: [اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَّا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ھَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ] خدا نے سات آسمانوں کو اوپر تلے بنائے پھر ارشاد ہوتا ہے کہ رحمان کی خلق میں تم کو کچھ تفاوت فرق نظر نہیں آئے گا (۶۷:۳)۔ [ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّھُوَ حَسِیْرٌ] اور تم اپنی نگاہ سے دیکھ سکتے ہو کہ اُس میں کوئی فرق نہیں ہے، ایک دفعہ نہیں دو دفعہ اور تین دفعہ دیکھ سکتے ہو اور تیسری دفعہ تمہاری نگاہ تھک کر واپس آئے گی اور خدا کی خلق

میں، رحمان کی خلق میں کوئی فرق وتفاوت نہیں پائے گی (۶۷:۳۔۴) اِس آیت سے یوں لگتا ہے کہ یہ مساواتِ رحمانیہ کا ذکر ہے جو مونوریالزم ہے۔ اگر ہم اِس آیت کے معنی کو اِس طرح سے لیں کہ سات آسمان ہیں جو آسمانِ اوّل سے شروع ہو جاتے ہیں پھر دُوسرا آسمان اِس سے بڑا ہے، تیسرا اُس سے بڑا ہے، چوتھا اُس سے بڑا ہے اور سب سے جو باہر کا آسمان ہے وہ سب سے عظیم ہے اور اگر ہم اِس کا تصور یہ کریں تو پھر اِس میں ضرور فرق وتفاوت ہے، لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ جو آسمان ہی بہر حال اُن میں کوئی فرق وتفاوت نہیں ہے۔ اِس کے لئے دو باتیں ممکن ہیں، ایک یہ کہ یہ سات آسمان برابر برابر ہیں فی الوقت یا یہ ہے کہ فی الوقت اُن میں برابری نہیں ہے لیکن اُن میں (changing) ہوتی رہتی ہے ۔ ہر صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ خداوند عالم نے سات آسمانوں کا جیسے ذکر فرمایا اور اُسی کے ساتھ فرمادیا، کہ رحمان کی خلق یہ سات آسمان میں ہے اور اِن میں کوئی تفاوت نہیں اور یہ جو ارشاد ہوا کہ تم ایک بار دیکھو، دوسری بار دیکھو اور جب تیسری بار دیکھو گے تو تمہاری نگاہ تھک جائے گی، اِس کا اشارہ یہ ہے کہ ایک بار دیکھنے کا مطلب دو (opposite) چیزوں میں سے ایک چیز کو دیکھنا، دو بار دیکھنے کا اشارہ دونوں (opposite) چیزوں کو اِس طرح سے دیکھنا کہ وہ ایک دوسرے سے پیدا ہو رہی ہیں ۔ مثلاً نیستی سے ہستی پیدا ہوگئی، تو یہ دو دفعہ دیکھنا ہوا اور تیسری دفعہ دیکھنے کے بعد نگاہ کے تھک جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نیستی سے ہستی پیدا ہوگئی پھر ہستی کیا ہوگئی نیستی میں بدل گئی پھر نیستی کو کیا ہوا، وہ نیستی سے ہستی پیدا ہوگئی کیونکہ شروع میں نیستی سے ہستی پیدا ہوگئی تھی، تو یہ (circle) بن گیا۔ اب لاانتہائی شروع ہوگئی اور اِس لاانتہائی کے نتیجے میں نگاہ تھک گئی، نگاہ کے تھکنے کا مطلب لاانتہائی ہے۔

میں اِس پوائنٹ کو (repeat) کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ بہت اہم (logic) ہے ۔ مثلاً آپ کے سمجھانے کے لئے میں سوال کرتا ہوں کہ ہستی کس چیز سے پیدا ہوگئی ؟ آپ کہیں گے نیستی سے تو یہ اُصول بن گیا کہ ہستی نیستی سے پیدا ہوگئی ۔ اب جب ایک چیز دوسری چیز سے پیدا ہوتی ہے، تو پھر میں سوال کروں گا کہ نیستی کس چیز سے پیدا ہوئی ؟ اِس کے لئے آپ کو ذرا غور کرنا پڑے گا لیکن غور کے نتیجے میں یوں کہنا پڑے گا کہ نیستی ہستی سے بنتی ہے ۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ چیزیں نیست ہو جاتی ہیں ختم ہو جاتی ہیں تو دونوں چیزوں کا رُخ ہے، آپ ایک ایسا تیر بنائیں نیستی سے ہستی کی طرف ایک تیر کو کھینچیں اور پھر ہستی سے ایک تیر بنائیں نیستی کی طرف، اب کیا ہوا نیستی کا رُخ ہستی کی طرف، ہستی کا رُخ نیستی کی طرف تو اب (circle) بن گیا۔ اب آپ کہئے کہ نیستی سے ہستی، ہستی سے نیستی، نیستی سے ہستی، ہستی سے نیستی اور کتنی دفعہ آخر کہتے جائیں گے اور کتنی دفعہ دیکھتے جائیں گے، آپ کی نگاہ تھک جائے گی، تو مطلب نگاہ کے تھکنے کا یہ ہے کہ لاانتہائی ہے، یعنی یہ معاملہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے ۔ جیسے حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ: یہود کا یہ تصورِ تخلیق صحیح نہیں کہ خدا نے کائنات اِس طرح سے پیدا کیا کہ اِس سے پہلے اُس نے کبھی کوئی چیز پیدا نہیں کی تھی، اُس نے گویا ایک نیا کام کیا

اُس کی خدائی نے، یہ صحیح نہیں ہے بلکہ اسلام کا تصورِ تخلیق یہ ہے(concept of creation) کہ خدا ہر وقت پیدا کرتا رہتا ہے، اُس تخلیق ایک لاانتہا سلسلہ ہے[اسلام میرے مورثوں کا مذہب، ص:۱۶]۔ پس خلقِ رحمان یا کہ مساواتِ رحمانیہ کا جو مسئلہ تھا وہ ایک طرح سے حل ہوگیا کہ آسمان یا تو ساتوں برابر ہیں یا نہیں تو وہ درجہ وار ہیں لیکن درجہ وار ہونے کے باوجود اِن میں اتنا ٹائم ہے اتنا موقع ہے، کہ اِس تبدیلی میں اِس (changing) میں وہ فرق وتفاوت نکل جاتا ہے اور اِس مقام پر مونوریالزم کا ذکر آتا ہے۔

یہاں پر مزید وضاحت کرتے چلیں وہ یہ کہ سات آسمان سے کیا مراد ہے؟ رُوحوں کے سات اُونچے درجے ہیں، رُوحوں کا شمار نہیں ہوسکتا ہے لیکن رُوحوں کا شمار اِس طرح سے ہوتا ہے، کہ رُوحوں کے بڑے سات گروپ ہیں، وہ سات گروپ سات درجے ہیں، وہی سات درجے سات آسمان ہیں، اور پھر اُن کے مقابلے میں سات زمین بھی ہیں۔ کہنا یوں ہے کہ جہاں خداوندِ عالم قرآن میں آسمان اور زمین کا ذکر فرماتا ہے تو اُس سے کوئی مادّی آسمان اور مادّی زمین مراد نہیں ہوتی ہے، وہ رُوحانیت کے آسمان ہوتے ہیں اور رُوحانیت کی زمین ہوتی ہے۔ مگر ایک بات یہ یاد رکھئے گا کہ اِس زمین سے اور اِس آسمان سے کیا مراد ہے؟ وہ موقع کے مطابق تاویل ہوتی ہے، جیسے وجہِ دین کے اندر ناطق کو آسمان کہا اور اساس کو زمین لیکن تاویل بدلتی رہتی ہے، جیسے میں نے اللہ کے ہاتھ کی تاویل کی، اور مثال بتائی کہ کبھی تو اللہ کے دونوں ہاتھوں سے عقلِ کُل اور نفسِ کُل مراد ہوتے ہیں جو عظیم فرشتے ہیں کبھی ناطق اور اساس مراد ہوتے ہیں۔

اِس کے بعد ہم پانچویں آیت میں جاتے ہیں اور چوتھی آیت تیسری کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ خدائے جلیل وجبّار کا فرمان ہے کہ: ''وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ ۖ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ'' (۶۷:۵) ہم نے رُوحانیت کے نزدیک ترین آسمان کو چراغوں سے زینت دی ہے اور اُس آسمان کو شیاطین سے حفاظت کا ذریعہ بنایا ہے۔ اِس کی تشریح یہ ہے کہ شیاطین آسمانوں کی طرف پرواز کرنا چاہتے ہیں، کیوں؟ خداوندِ عالم کا ایک دربار ہے اُس میں ملاءُ الاعلیٰ یعنی عظیم فرشتے، سردار فرشتے آپس میں اسرارِ خداوندی پر گفتگو کرتے ہیں، اُس گفتگو کو سننے اور وہاں سے کچھ باتیں چوری کرنے کے لئے شیاطین پرواز کرتے ہیں۔ لیکن خداوندِ عالم نے رُوحانیت کے آسمانوں کو آسمانِ اوّل سے محفوظ کیا ہے، یعنی آسمانِ اوّل پر کچھ ایسا بندوبست کیا ہوا ہے، کہ اُس میں بہت سے چراغ روشن ہیں اور جیسے ہی کوئی شیطان آسمان کی طرف پرواز کرتا ہے، تو وہ چراغ اُس پر شعلے پھینکتے ہیں، یہ بات بہت اہم ہے اِس لئے میں یہاں کچھ مزید تشریح کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ کافی نہیں ہے، کہ کیوں خدا نے شعلے رکھے ہیں اور سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے، کہ اُن شیاطین کو کہاں تک آزادی ہے اور کیا وہ ہر جگہ پر جاسکتے ہیں یا کیا، تو بات یہ ہے کہ شیاطین رُوحانیت کی زمین تک جاسکتے ہیں اور آسمانِ اوّل کی فضاؤں میں پرواز بھی کرسکتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی کسی شیطان

نے آسمانِ اوّل کی بلندی کی طرف پرواز کی تو اُوپر سے شعلے برسے اور اُس کو لوٹا دیا گیا۔

اب آپ یہ سوال کریں کہ اِس کا کیا مطلب، آیا یہ ایک مثال ہے یا ایک حقیقت ہے، کوئی واقعہ ہے اور آیا اُس واقعہ کے پیچھے کوئی تاویل بھی ہے یا کیا، مثال کے طور پر یہ ہے، کہ دنیا کے اندر جتنے مذاہب ہیں وہ روشنی کو دیکھتے ہیں اور اسماعیلی بھی دیکھتے ہیں لیکن فرق کیا ہے، اسماعیلی اُس روشنی سے (cross) کر جاتے ہیں نورِ ہدایت کی دستگیری سے اور دیگر لوگ جو تاویل میں شیاطین کہلاتے ہیں اُس روشنی سے واپس لوٹتے ہیں، کیوں؟ اُس خداوندِ عالم نے اتنا زبردست امتحان رکھا ہے، کہ وہ امتحان اِس مادّی دنیا میں مادّیت میں ختم نہیں ہوتا ہے بلکہ اِس امتحان کے سخت ترین مراحل رُوحانیت میں داخل ہیں تاکہ کوئی شخص اُس روشنی کو دیکھتے ہوئے یہ دعویٰ کرے کہ اُس نے خدا کے نور کو دیکھا، تاکہ کوئی خدائی کا بھی دعویٰ کرے، تاکہ کوئی سمجھے کہ اُس کو نجات بھی مل چکی ہے۔ لیکن خدا کے نزدیک وہ نار ہے، کیونکہ نور اور نار ایک ہی (root) سے ہے اور ایک ہی چیز ہے۔ جس طرح دُنیا میں بھی نور اور نار عربی کے دو لفظ ہیں، جن کا (root) ایک ہے، نور معنی روشنی نار معنی آگ، جس طرح مادّیت میں آپ دیکھتے ہیں کہ آگ پکاتی بھی ہے اور جلاتی بھی ہے، ہاتھ ڈالیں تو ہاتھ جلا دے گی اور غذا بھی پکائے گی۔ آفتاب کو دیکھیں کہ ساری آبادی اِسی سے ہے، اور ساری بربادی اِسی سے ہے اِس لئے جو لوگ ہادیٔ برحق کے بغیر رُوحانیت میں داخل ہوجاتے ہیں اُن کو وہاں خدا سرگردان کر دیتا ہے، اُن پر شعلے برساتا ہے اور جو امام کی ہدایت کی روشنی میں چلتے ہیں، تو وہ اُن چیزوں سے اور اُن تجربات سے آگے بڑھتے ہیں رُوحانیت کی بلندیوں میں، رُوحانیت کے آسمان پر جاتے ہیں، جہاں پر علم و حکمت اور خدا کے بھید ہیں۔

ظاہر میں بھی اِس جیسی ایک بات ہے، دُنیا میں امامؑ کی شخصیت اُس آسمانِ رُوحانیت کی مثال ہے، امامؑ کی شخصیت آسمانِ روحانیت کی مثال ہے چونکہ آسمانِ روحانیت بھی خود ہے اور اِس کی مثال بھی خود ہے۔ امامؑ کی شخصیت میں بھی بہت سے چراغ لگے ہوئے ہیں وہ اُن کے بشری اوصاف ہیں، اوصاف (attributes)، مومنین کے لئے اُن (attributes) میں روشنی ہے اور جو اہلِ انکار ہیں، جو امامؑ کے مخالفین ہیں جو امامؑ کے دشمن ہیں اُن کے لئے وہ (attributes) آگ کے شعلے ہیں۔ کسی بھی موقع پر امام کی ضرورت کو محسوس کر کے آگے بڑھتے ہیں، کبھی تلاش بھی کرتے ہیں، کبھی سوچ میں بھی پڑتے ہیں، رُوحانی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی، چونکہ آگے امام ہیں اور کوئی نہیں ہے، تو امام کی طرف، رستے میں امام ہے، امام کا مطلب ہے آگے لیکن ہر بار اُن پر ایک شعلہ گرتا ہے۔ بشری اوصاف میں سے، جسم کی باتوں میں سے، شادی سے، بیاہ سے، کھانے سے، پینے سے، جسم سے، لباس سے، نسل سے، اصل سے اور امام کی ظاہریت سے، بہت سے، بہت سے، بہت سے شعلے، تو رُوحانیت میں چونکہ وہ ایک روشن دنیا ہے، اُس میں روشنی کے ساتھ ہوتی ہے اور یہاں صرف معنی کے طور پر معنوی طور پر یہ واقعہ پیش آتا ہے اور اِس دنیا میں امام کی روشنی اِس طرح

سے ہے، اور رُوح کی دنیا میں جو روشنی ہے وہ (light) کے ساتھ ہے، تو یہ مثال بھی ہے اور ممثول بھی ہے۔ اِس سلسلے میں آپ نوٹ کر کے ایک ایک بات پوچھ لینا میں آپ کو ضرور سمجھاؤں گا، اور بڑی وضاحت کے ساتھ اِس کو حفظ کرنے کی ضرورت ہے۔ اب اِس مقام پر یہ پوچھیں کہ شیاطین کیوں اور کس (sense) میں، یہ کیا اصطلاح ہے اور کیا لفظ ہے، یاد رہے کہ خلیفۂ خدا سے جو لوگ مخالفت کرتے ہیں اُن کی حکم عُدولی کرتے ہیں وہ شیاطین ہیں قرآن کے نزدیک، کیونکہ سب سے پہلے جو شخص شیطان قرار پایا تھا، اُس میں اُصول یہ ٹھہرا کہ اُس نے خلیفۂ خدا کو نظر انداز کیا اُس کو حقیر سمجھا۔ آج اِس دُنیا میں امام کو حقیر سمجھنے والے بہت ہیں، کسی کو داڑھی پر فخر ہے، کسی کو قصّے کہانی پر فخر ہے اور کسی کو کسی چیز پر اور کسی کو کسی چیز پر، تو امام پر لوگ اعتراض کرتے ہیں، یہی بات ابلیس نے، شیطان نے بھی کی تھی لہٰذا یہ خدا کا قانون ہے۔

”وَاَعۡتَدۡنَا لَـهُـمۡ عَذَابَ السَّعِيۡـرِ“ (۵:۶۷) اور ہم نے اُن کے لئے دہکتی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے ”وَلِلَّـذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِرَبِّهِـمۡ عَذَابُ جَهَنَّـمَ“ (۶:۶۷) اور جن لوگوں نے اپنے پروردگار سے انکار کیا تو اُن کے لئے جہنم کا عذاب تیار ہے۔ ”وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡـرُ“ (۶:۶۷) اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔ ”اِذَاۤ اُلۡـقُوۡا فِيۡـهَا سَـمِعُوۡا لَـهَا شَهِيۡقًا وَّهِىَ تَفُوۡرُ“ (۷:۶۷) جب وہ اُس دوزخ میں ڈالے جائیں گے، تو اُس کا چیخنا چلانا سنیں گے اور وہ جوش مار رہی ہوگی [تَكَادُ تَمَيَّـزُ مِنَ الۡغَيۡظِ ؕ كُلَّمَاۤ اُلۡقِىَ فِيۡـهَا فَوۡجٌ سَاَلَـهُـمۡ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمۡ يَاۡتِكُمۡ نَذِيۡرٌ (۸:۶۷)] گویا مارے جوش کے پھٹ پڑے گی، جب اُس میں اُن کی کوئی جماعت ڈالی جائے گی، تو دوزخ کے داروغہ اُن سے پوچھیں گے تمہارے پاس کوئی ہدایت کرنے والا نہیں آیا تھا۔ ابھی دیکھیں قرآن کے اُصولات کو جو لوگ دوزخ میں داخل کئے جاتے ہیں اُن سب کا مجموعی طور پر (on the whole) ایک ہی گناہ ہوتا ہے۔ حالانکہ نظرِ ظاہر سے دیکھا جائے تو یوں لگتا ہے کہ اسلام اور شریعت کو سامنے رکھنے سے بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کے نہ کرنے سے جہنم میں جانے کا وعید کیا گیا ہے۔ لیکن دیکھیں یہاں ایک ہی بات اور ایک ہی سوال ہوتا ہے، اُن کے دیگر گناہوں کی کوئی بات تفصیل سے نہیں پوچھی جاتی ہے، اور سب سے موٹی بات یا موٹا اُصول یہ پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے پاس کوئی ہدایت کرنے والا نہیں آیا تھا۔ یہ پیغمبر بھی ہوسکتا ہے ہدایت کرنے والا اور امام بھی ہوسکتا ہے اور کیونکہ امام پیغمبر کے ساتھ ایک ہے، اور دونوں کا کام ایک ہے۔ [قَالُوۡا بَلٰى قَدۡ جَآءَنَا نَذِيۡرٌ ۙ فَكَذَّبۡنَا وَقُلۡنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنۡ شَىۡءٍ ۖۚ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ كَبِيۡرٍ (۹:۶۷)] وہ کہیں گے کیوں نہیں، ضرور ہدایت کرنے والا آیا تھا لیکن ہم نے اُس کو جھٹلا دیا۔ کیا کہتے ہیں؟ کیوں نہیں، آیا تھا لیکن ہم نے اُس کو جھٹلا دیا، وہ اپنے قصور کو ظاہر کر رہے ہیں اور دوزخ کے جو داروغے ہیں [یعنی] فرشتے وہ اُسی اہم سوال کو پوچھ رہے ہیں جو پوچھنا چاہئے اور دوزخی صاف صاف کہہ رہے ہیں، کہ ہادی تو آیا تھا یا ڈرانے والا آیا تھا لیکن ہم نے اُس کو جھٹلایا۔ کس طرح جھٹلایا؟ اور کہا کہ خدا نے تو کوئی چیز نازل ہی نہیں کی ہے، تم تو بڑی غلطی میں پڑے

ہوئے ہو۔ یعنی خدا نے کوئی ہدایت نہیں بھیجی ہے، اِس میں پیغمبر اور امام دونوں کا ذکر ہے۔ پھر وہ تفصیل کرتے ہیں اپنی نافرمانی یعنی جس کی وجہ سے وہ دوزخ میں داخل کئے گئے ہیں اُس کی وہ تفصیل بیان کرتے ہیں۔ ''وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ'' (۱۰:۶۷) اور کہیں گے کہ اگر ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو دوزخیوں میں نہ ہوتے۔ دیکھا اب اُنہوں نے صاف بتا دیا اُن کے جو دیگر گناہ ہیں اُن کا ذکر یہاں نہیں ہے، نافرمانی کا ذکر ہے، ہادی کو پیغمبر کو اور امام کو نہ ماننے کا ذکر ہے یعنی ہم اگر سنتے اور سمجھتے، تو پھر ہم یہاں دوزخ والوں میں نہ ہوتے۔ سنتے اور سمجھتے اور نہ سمجھنے میں ایک خاص علم کی کمی رہی، نہ سننے اور نہ سمجھنے میں ایک خاص قسم کے علم کی کمی رہی، آپ اُس کو علم الیقین بھی کہہ سکتے ہیں، علمِ دین بھی کہہ سکتے ہیں، علمِ رُوحانی بھی کہہ سکتے ہیں، معرفت بھی کہہ سکتے ہیں، یعنی یہاں اُن کے کسی اور قصور کا ذکر ہی نہیں، صرف یہ کہ وہ سمجھتے نہیں تھے اور سنتے نہیں تھے۔

''فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ'' (۱۱:۶۷) پس وہ اپنے گناہوں کا اقرار کریں گے اور دوزخیوں کے لئے رحمتِ خدا سے دُوری ہے، تو لعنت جس چیز کا نام ہے وہ خدا کی رحمت سے دُوری کا نام ہے۔

آگے چل کر [هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ۭ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ] (۱۵:۶۷) وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو نرم کیا، تو اُس کی راہوں میں چلو پھرو اور خدا کا دیا ہوا رزق کھاؤ، یہ مومنوں کی طرف خطاب ہے، کہ زمینِ رُوحانیت مومنین کے لئے مسخّر کی گئی ہے۔ یہاں پر ایک اِستعارہ ہے وہ یہ کہ: خدا نے زمین کو تمہارے لئے نرم کیا اور اُس کی راہیں تمہارے لئے بہت ہی آسان کر دی اور تو زمین کے کندھوں پر چلو پھرو (۱۵:۶۷) ''مَنَاكِبِ'' کندھوں کو کہتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ حدودِ جسمانی کی مثال ایسی ہے کہ مریدوں کو اپنے کندھوں پر لئے چلتے پھرتے ہیں، جس طرح کوئی باپ اپنے کمزور بچّوں کو کندھے پر اُٹھا کے چلتا ہے۔ یعنی دین کے اندر ایسی کچھ آسانیاں ہیں ناطق، اساس، امام اور پیروں کی بدولت، کہ وہ مریدوں کو اپنے کندھوں پر لے کر چلتے پھرتے ہیں۔ اِسی کی مثال زمین سے دی گئی، اور فرمایا کہ تم زمین کے کندھوں پر چلو پھرو اور زمین تمہارے لئے بہت ہی آسان کر دیا یعنی حدودِ رُوحانی تمہارے لئے یہ کام کرتے ہیں۔

اِس میں اور کئی اہم آیات ہیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ [اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰي وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ] (۲۲:۶۷) خداوندِ عالم نے فرمایا ہے، دو آدمیوں کی مثال دیتا ہے، ایک شخص جو کہ جانور کی طرح ہاتھوں کے بل چلتا ہے، منہ کے بل چلتا ہے، اور دوسرا بالکل قدرتی پوزیشن میں چلتا ہے جس طرح کہ ایک تندرست انسان کو چلنا چاہئے، وہ صراطِ مستقیم پر چلتا ہے، اور خداوند ارشاد فرماتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اِن دونوں میں کونسا شخص زیادہ ہدایت یافتہ ہے (۲۲:۶۷)۔ ایک تو جانور کی طرح ہاتھ، پاؤں اور چار پا ہو کے چلتا ہے اور دوسرا انسان کی

طرح سیدھا سیدھا چلتا ہے جو راہِ راست پر ہے، تو ہدایت کے لحاظ سے اِن دونوں میں کون بہتر ہے؟ ظاہر ہے کہ جو شخص جانور کی طرح چلتا ہے، تو اُس کے لئے مجبوری یہ ہے کہ وہ رستے کو نہیں دیکھتا ہے، تاریکی ہے، اُس کو یقین نہیں ہے کہ راستہ ہے، اُس کے سامنے تاریکی ہے، وہ ڈرتا ہے کہ کھڑے کھڑے چلے تو گر جائے یا کسی چیز سے ٹکر جائے اِس لئے وہ جانور کی طرح چلتا ہے اور دوسرا جو سیدھا چلتا ہے اُس کو یقین ہے کہ یہی راستہ ہے اور روشنی ہے، تو دنیا کے اندر دو قسم کے لوگ ہیں، کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اُن کو یقین حاصل ہے دین کے معاملے میں، کہ یہی راہِ خدا ہے وہ چلتے ہیں بڑے اطمینان سے اور کچھ لوگ گمان میں ہیں خدا کی نظر میں وہ اِس کو البتہ نہیں سمجھتے ہیں لیکن خدا جس طرح دیکھتا ہے وہی بیان کرتا ہے، کہ وہ ایسے چلتے ہیں جس طرح رات کی تاریکی میں کوئی خطرہ محسوس کرتا ہے، کہ وہ گر جائے گا اور کسی چیز کے ساتھ، پتھر کے ساتھ، درخت کے ساتھ ٹکرا کھائے گا لہٰذا وہ جانور کی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہے چونکہ وہ رستے پر نہیں، تو یہ ست پنتھ اور اِس کے باہر جو ہیں اُس کی ایک مثال ہے۔

ایک اور آیت ہے اِس میں ہے کہ: وہ خدا ہی تو ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔ "قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ" (۶۷:۲۳) "اَنْشَاَكُمْ" میں انسان کی تخلیق مکمل ہو جاتی ہے۔ "وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ" (۶۷:۲۳) اور تمہارے کان بنائے، آنکھیں بنائیں اور دل بنائے۔ کان پیغمبر، آنکھیں اساس، دل قائم القیامت۔ ایسی بھی تاویل ہوتی ہے۔ آخر میں ہے کہ: "قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاۗؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَاۗءٍ مَّعِيْنٍ (۶۷:۳۰) کیا تم نے دیکھا اگر تمہارا یہ پانی گہرائی میں جائے تو پھر بہنے والا پانی تم کو کون لے آئے گا۔ یہ علم کی مثال ہے، علم کی بہت خوبصورت مثال ہے، دیکھئے کہ اب اِس وقت سمندر زمین کی سطح پر ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ کبھی یہ زمین کی گہرائی میں جائے، زمین کی گہرائی میں پانی جائے گا یا نہیں جائے گا لیکن جو دوسرا پانی ہے علم کا، ہم آپ کو دکھائیں گے کہ یہ پانی زمین کی گہرائی میں چلا گیا ہے۔ زمین یہاں قرآن، پانی علم، پانی کا زمین کی گہرائی میں چلے جانا یہ کہ سطح پر جو پانی تھا وہ ختم ہو گیا اور اب علم کا پانی قرآن کی گہرائی میں ہے یعنی اِس وقت تاویلی ہدایت کی ضرورت ہے لیکن لوگوں کو خبر نہیں ہے کہ اُن کا پانی ختم ہو چکا ہے، جو اصل پانی ہے وہ گہرائی میں چلا گیا ہے۔ پھر خدا پوچھتا ہے کہ اب تم کو کون لے آئے گا گہرائی۔۔۔۔۔ (یہاں لیکچر ختم ہو جاتا ہے)

ٹائپنگ: شناوزیر علی　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: قرآن کے مطالب کو سمجھنا

کیسٹ نمبر: Q-22 تاریخ: جون/ ۱۹۸۲ء کراچی

Click here for Audio

آج اِس مختصر سے لمحات میں ہم گفتگو کریں گے، کہ قرآنِ مقدّس کے بعض ضروری مطالب کو کس طرح (cover) کر لینا چاہیئے، کیونکہ قرآن کی وسعتوں کی بات کریں، تو یہ ایک بے پایان سمندر بھی ہے اور اِس کے مختصر سے مختصر مطالب بھی ہوسکتے ہیں۔ آپ اِس حقیقت کے سلسلے میں باور کرتے ہیں، لہٰذا قرآن کے وسیع سے وسیع ہونے اور مختصر سے مختصر ہونے کے بارے میں زیادہ دلائل کی ضرورت نہیں ہے، مگر میں اِس سلسلے میں بات کرنا چاہوں گا کہ ہمیں کن کن طریقوں سے قرآن کو یعنی قرآن کے بعض ضروری مطالب کو (cover) کر لینا چاہیئے۔ اِس کے کئی طریقے ہیں، یعنی قرآن کو خلاصے کے طور پر سمجھنے کے کئی طریقے ہیں، اُن میں سے ایک طریقہ تو یہ ہے، کہ ہم بعض اُن آیات کو لیں جو اسلامی اور اسماعیلی نقطۂ نظر سے ضروری ہیں، کہ اگر اُن آیات کو گہرائی سے سمجھ لیا جائے تو یوں ہوگا جیسا کہ ہم نے پورے قرآن کو سمجھ لیا۔ اِس سلسلے میں مولانا مرتضیٰ علی صلوات اللہ علیہ کا ایک ارشادِ گرامی ہے جو فرمایا کہ: ’’ولنا کرائم القرآن‘‘ قرآن کی عظیم ترین آیات ہماری شان میں ہیں۔ [شرح الاخبار، جلد ۹، علیؑ فی القرآن، ص ۳۵۳] اگر ہم اِن عظیم ترین آیات کی حکمتوں کو سمجھ لیں، تو انہی کے اندر سارے قرآن کا مطلب مل جائے گا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ناموں کو قرآن کے مضامین قرار دیں، یہ اِس لئے کہ قرآن کی اکثر و بیشتر آیتیں اسمائے الٰہی کی تشریح و تفسیر ہوا کرتی ہیں، اور آپ دیکھتے ہیں کہ کسی آیت کے آخر میں اکثر ایک اسم آتا ہے، یعنی خدا کا کوئی نام آتا ہے، اُس صورت میں آیت کا سارا مطلب اُس نامِ خدا میں سما جاتا ہے، اور ویسے بھی سوچا جائے تو یہ بات بڑی آسان ہے سمجھنے کے لئے، کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اِس کے اندر جتنی بھی ہدایات اور جتنے بھی ارشادات آئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف و صفات کے تحت ہیں یا یوں کہنا چاہیئے کہ اللہ جو کچھ کرتا ہے یا جو کچھ فرماتا ہے وہ اللہ کے ناموں کے تحت ہے یعنی اللہ کی صفات کے تحت ہیں۔ یہ بحث الگ ہے کہ اللہ کا حقیقت میں قول و فعل ہے یا نہیں ہے، یہ موضوع ہی الگ ہے، لیکن فی الوقت ہم اِس کو اسطرح سے لیتے ہیں جیسا کہ اللہ کا قول ہو اور اُس کا فعل ہو، چنانچہ ہم جب اللہ کے ناموں کی حقیقت کو سمجھ پائیں گے، تو اسی کے ساتھ ساتھ قرآن کا (essence) آجائے گا اور اسی میں اللہ کا قانون اور اُس کی

عادت سے آگہی بھی حاصل ہوگی، یہ دوسرا طریقہ ہے۔

تیسرا ایک اور طریقہ ہے قرآن کو (cover) کرنے کے لئے، وہ یہ ہے کہ ہم دیکھیں گے کہ قرآن کے اندر کتنی آیات ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (۶۶۶۶) ہیں، ہم دیکھیں گے کہ اِن آیات کے گروپ ہو سکتے ہیں یا کہ ان میں سے ہر آیت الگ قسم کی ہے۔ جب دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ اِن تمام آیات کے گروپ ہیں، اور یہ کُل بارہ گروپ ہیں، اِس سلسلے میں ہم سب سے پہلے جب دیکھتے ہیں تو آیاتِ امر کا گروپ ملتا ہے۔ اِس کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی ہے کہ امر کیا ہے؟ امر کے معنی سب سے پہلے حکم کے ہیں، اور پھر یہ عالمِ امر بھی ہے، وغیرہ، تو اِس گروپ میں ہزار آیتیں ہیں۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ جتنی آیات امر سے متعلق ہیں اُن کے آپس میں لازمی طور پر ربط ہے، (connection) ہے، اُس میں ہم (important) آیات کو چن سکتے ہیں، اور امر کا ایک الگ موضوع بنا کے اُس میں دیکھ سکتے ہیں، اُس پر ریسرچ کر سکتے ہیں، اُس کی (study) کر سکتے ہیں، اُس پر لکھ سکتے ہیں، اُس پر بول سکتے ہیں، اور اِس سلسلے میں ہم نے (diagrams) بھی بنائے ہیں۔

مثال کے طور پر امر کے موضوع کے سلسلے میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے فرمایا کہ: ”یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ“ (۴:۵۹) یہ آیت (principle) قسم کی، اُصولی قسم کی ہے، اور اِس آیت کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ جس آیت کے اندر خدا اور رسول اور صاحبِ امر کا ایک ساتھ ذکر آتا ہے اس کی بہت بڑی اہمیت ہوتی ہے، آپ بتائیں کیوں؟ اِس لئے کہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ امر جو سب سے بلند ترین حقیقت ہے، اُس کا یہاں اِس طرح سے ذکر ہے کہ امر، صاحبِ امر کے سپرد ہے، وہ اِس طرح کہ جس آیت میں اللہ و رسول اور صاحبِ امر کا ذکر ہے تو ہادئ برحق کو یعنی امامِ زمان کو صاحبِ امر قرار دینا، درحالیکہ اسی آیت کے اندر خدا کا بھی ذکر ہے اور رسول کا بھی ذکر ہے، تو یہ بہت بڑی بات ہے، اور میں نے کہا کہ امر سب سے بلند ترین حقیقت ہے، وہ اِس لئے کہ اِس کائنات کے پیدا کرنے میں سب سے پہلے لفظِ کُن آتا ہے اور کُن امر ہے، اور آپ جب بھی اسماعیلی یا اسلامی فلسفے کی کسی کتاب کو اُٹھا کے دیکھیں گے یا آفرینشِ کائنات کے قصے میں جائیں گے یا قرآن کے اِس امر کے موضوع کو لیں گے تو اُس وقت پتا چلے گا کہ خداوند نے سب سے پہلے کُن فرمایا۔ اب اس آیت کی روشنی میں جب ہم باور کرتے ہیں تو صاحبِ امر جو ہے وہ امام ہے، تو بہت ہی ممکن ہے کہ یہ کُن بھی امام نے فرمایا ہو، کیونکہ خدا ہی نے فرمایا کہ کُن کا مالک امام ہے، یہ اِس لئے کہ ابھی ابھی میں نے تھوڑا سا اشارہ کیا تھا کہ وہ بحث الگ ہوگی کہ خدا کا قول اور فعل ہے یا نہیں ہے، تو لیکن قدرتی طور پر یہ بات سامنے آگئی تو ہم اِس کو کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں۔

بہر حال یہ تو بہت گہری بات تھی، ہمیں شاید نہیں بتا دینی چاہئے تھی یا بتا دینی چاہئے تھی، تو ہر صورت میں اب ہزار

آیتیں اسی صاحبِ امر سے متعلق ہو جائیں گی۔ یہ بات الگ ہے کہ جہاں صرف اللہ کا ذکر ہے، تو اُس میں اللہ یہ ضرور فرمائے گا کہ اُس نے کُن فرمایا اور کُن سے کائنات کو پیدا کیا، لیکن جس آیت کے اندر اِن تین درجات کا ذکر آتا ہے، خدا، رسول اور امام کا تو اِس میں واضح طور پر خدا نے صاف الفاظ میں فرمادیا کہ امر کا مالک امام ہی ہے، سو یہ بہت ممکن ہے کہ خدا جب فرماتا ہے کہ اُس نے کُن فرمایا وہ اِس طرح سے فرمایا ہو، کہ امام کے فعل کو، امام کے قول کو اپنی ذات سے (adopt) کرتا ہو، کیونکہ یہ خدا کی عادت ہے، قرآن میں جا کے دیکھیں گے، اور گہرائی کے ساتھ (study) کریں گے تو یہ راز آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ خدا اپنے نمائندوں کے قول و فعل کو اپنی ذات سے (adopt) کرتا ہے۔ جیسے ایک آیت میں ہے ''وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى'' (۱۷:۸) اے رسول! جس وقت آپ نے کنکریاں پھینکیں، تو یہ آپ کا کنکریاں پھینکنا خدا کا پھینکنا، اور جیسے بیعت کے سلسلے میں فرماتا ہے کہ آپ نے جو لوگوں سے بیعت لی گویا وہ بیعت میں نے لی، آپ کا ہاتھ گویا میرا ہاتھ ہے (۱۰:۴۸) تو جس طرح رسول کے قول و فعل کو خدا اپنی ذات سے منسوب کر لیتا ہے، اسی طرح امام کے قول و فعل کو اپنی ذات سے منسوب کر لیتا ہے۔

قرآن کے اندر سب سے اُونچا موضوع ہے بھی امر سے متعلق، یہ بہت ہی باریک اور خاص بھی ہے، بلند ترین بھی ہے، جب مومنین اِس کو سمجھ لیتے ہیں تو دیگر بھیدوں کے سمجھنے میں دقت پیش نہیں آتی ہے۔ اِس سلسلے کی بات کو ہم کسی قدر مختصر کریں گے، اب امر کے بارے میں تھوڑی سی مثال پیش کی گئی، اُس کے بعد نہی سے متعلق جو ہزار آیات کا گروپ ہے، اُس کی طرف جاتے ہیں اور اُس کی بات کرتے ہیں، تو امر حکم کا نام ہے، کرنے کو، کہنے کو امر کہا جاتا ہے اور اِس کے (opposite) میں نہی ہے، جو منع کرنے کا نام ہے، تو وہ بھی اِس سے زیادہ مختلف نہیں ہے، جو امر کا مالک ہے وہی نہی کا بھی مالک ہے، جو حکم کرتا ہے وہی منع بھی کرتا ہے، تو اگر آیت کا دوسرا گروپ بھی اسی کے ساتھ ضم ہو جاتا ہے اور یہ آیات بھی امام کے (under) میں آتی ہیں، اور اِس میں زیادہ وقت نہیں لگائیں گے۔

اب تیسرے گروپ کی طرف جاتے ہیں، وہ ہے وعدہ، اور وعدہ اِس چیز کا نام ہے جو قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ اگر تم اچھے کام کرو گے تو تم کو جنّت دیا جائے گا، اِس میں ہزار آیات ہیں، وعدہ سے متعلق، تو یہ گروپ امر اور نہی سے الگ نہیں ہو سکتا ہے، تو جو حکم کا مالک ہے وہ وعدے کا بھی مالک ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وعدہ بھی اسی نے کیا ہو اور خدا اِس کو اپنی ذات سے منسوب کر لیتا ہو، دوسرا گروپ اُن آیات کا ہے جن میں وعید ہے، وعید معنی عربی میں ڈرانا یعنی یہ فرمانا کہ اگر تم برا کام کرو گے تو جہنم میں جاؤ گے، اِس قسم کی آیات ہزار ہیں، تو یہ وعدہ کے (opposite) میں آتی ہیں، تو ڈرانا بھی اُس کو چاہیئے جو وعدہ کرتا ہے، وہ بھی امر سے الگ نہیں ہے۔ تیسرا گروپ مثالوں کا ہے، کہ اُن میں مثالیں بیان کی گئی ہیں، اور میں آپ کو بتاؤں کہ قرآن میں سب سے بڑی اور سب سے اُونچی مثال وہ ہے جس میں اللہ کے نور کی مثال دی گئی

ہے۔اِس سے اُونچی کوئی مثال نہیں ہے،اِس لئے کہ اِس میں اللہ کے نور کی مثال ہے،اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ مثال بعد میں کس طرح پیغمبر اور امام کی طرف جاتی ہے۔پھر کبھی سوال بھی کرنا،نہیں تو ہم نے ایک کتاب کے اندر جو آیاتِ نور پر لکھی گئی ہے،اُس میں آپ کو بتایا گیا ہے کہ یہ پیغمبر اور امام کے نور کا ذکر ہے جو اللہ کا نور ہے،اللہ کا نور ہے،پیغمبر کا نور ہے اور امام کا نور ہے،ایک ہی بات ہے،کیونکہ ایک ہی نور ہے۔جس طرح نور روشنی کا نام ہے،اسی طرح نور کی مثال نے ہم کو سمجھا دیا بڑی پاکیزگی کے ساتھ کہ نور اللہ کا،رسول کا اور امام کا ایک ہی ہے۔اِس سے ہمیں آیۂ اطاعت کے سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملی،کیونکہ جب ہم نے "یَآ اَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡٓا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ"(۴:۵۹) کی آیت میں سوچا تھا تو اُس میں شاید خیال گزرا تھا کہ اللہ کا نور،رسول کا نور اور امام کا نور الگ الگ ہو،لیکن آیۂ نور نے ہم کو سمجھا دیا کہ وہ ایک ہی نور ہے۔

جب ہم کو معلوم ہوا کہ سب سے جو بڑی مثال ہے اُس میں ایک ہی حقیقت ہے،تو ہر مثال میں جو خدا کے بارے میں ہو یا پیغمبر کے بارے میں یا امام کے بارے میں تو ایک ہی بات ہے،کہنا چاہیئے کہ امام ہی کی مثال ہے،کیونکہ خدا کی تاویل بھی امام ہے اور پیغمبر کے جانشین بھی امام ہیں،تو اسی طرح ہزار آیات جو مثالوں سے متعلق ہیں وہ بھی اِس صاحبِ امر سے متعلق ہو جاتی ہیں۔اِس کے بعد قصص یعنی قرآنی حکایات یا (quranic stories) پر ہزار آیات ہیں،تو یہ آیات بھی امام سے الگ نہیں ہیں،اِس لئے کہ امام خدا کی تاویل ہیں اور پیغمبروں کے ساتھی بھی ہیں،اُن کے وزیر بھی ہیں،اُن کے جانشین بھی ہیں،اور اُن تاویلات کے اندر،اُن قسموں کے تاویلات کے اندر بھی امام اور اُس کے حدود کا ذکر آتا ہے۔اِس کے بعد حلال سے متعلق ۲۵۰ آیات ہیں،یعنی دُنیا کے اندر کونسی چیز حلال ہے یا کونسا جانور حلال ہے،تو یہ ایک شرعی موضوع ہے اور اِس کا سمجھنا بہت ہی آسان ہے،اِس میں کوئی اُلجھن نہیں ہے،یعنی حلال چیزوں کو سمجھنا اور دوسری آیات ہیں ۲۵۰،تو اِس گروپ سے متعلق بھی کوئی اُلجھن نہیں ہے کہ وہ ایک گویا کہ موضوع ہے حرام سے متعلق،اِس کو (cover) کرنا البتہ مشکل نہیں ہے،اور وہ حقائق کی بات نہیں ہے،حلال اور حرام کی بات ہے،دونوں ملا کر پانچ سو (۵۰۰) آیات بنتی ہیں،۲۵۰ اور ۲۵۰۔تیسرا ایک اور گروپ ہے جو سو (۱۰۰) آیات پر مشتمل ہے۔اِس کے اندر تسبیحات ہیں اور دُعائیں ہیں،یہ موضوع بھی آپ کے لئے بہت ہی آسان ہے،تو اِس میں عبادت ہے،اِس میں تسبیح ہے،تو دُعا یہ انداز میں ہے،خدا کی پاکیزگی کے بارے میں ہے،تو یہ مشکل نہیں ہے۔سب سے آخر میں جو موضوع رہتا ہے،وہ آیاتِ متفرقہ ہیں یعنی (miscellaneous) جو ۶۶ آیات ہیں۔یہ مختلف آیات ہیں،اِن کا کوئی مشترکہ موضوع نہیں ہے بلکہ مختلف موضوعات پر ہیں اور اِن میں سے ہر ایک آیت کو دیکھنا اور اُس کی نوعیت کو سمجھنا آسان ہے۔

اسی طرح اِن دس گروپوں میں قرآن تمام ہو جاتا ہے،اور قرآن کے ضروری مطالب کو (cover) کرنے کے

لئے ایک اور طریقہ ہے، وہ انبیا علیہم السّلام کے قصے ہیں، جو ہزار آیات پر مشتمل ہیں۔ اُن قصوں کو لیں تو انبیائے کرام کی تبلیغ و دعوت، اُن کے طریقۂ کار، اُن کی زندگی کے مختصر حالات، اُن کے زمانے کے مومنین اور کفّار کے احوال، پھر اُس کے اندر جو کچھ تاویل کا حصّہ ہے وہ، اِس سے بھی کافی حد تک قرآن (cover) ہو جاتا ہے، اور یہ ذکر اس لئے آیا کہ ہمارے ایک بزرگ اسکالر نے جو اپنے زمانے کے بزرگ تھے، قاضی نعمان نے اساس التّاویل کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں انبیاؑ کے ضروری قصّے ہیں اور اُن کی تاویلات ہیں۔ وہ اِس چیز کی اہمیت کو جانتے تھے اِس لئے انہوں نے کتاب بنائی، بہر حال آپ کی، ہماری یہ کوشش ہے، کہ قرآن پر کچھ کام کیا جائے، قرآن پر کچھ ریسرچ کی جائے، کیوں؟ کس لئے ضروری ہے؟ بہت سے معنوں میں یہ کام ضروری ہے اور اُس کی بہت سی وجہیں ہیں، اِس کی ضرورت ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے، کہ اب تک خانۂ حکمت نے اِس پر کافی کام کیا ہے اور اگر اِس کام پر کچھ اور بڑھا دیا جائے، تو یہ بہت ہی مفید کام ہو سکتا ہے۔ بلکہ کہنا چاہئے، کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ بہت ہوا، بہت (important) کام ہوا۔ کیونکہ یہ دیکھنا ہوتا ہے، کہ آپ سے، ہم سے یا کسی اور سے کیا کام آسکتا ہے، اور یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ جو کام آتا ہے اُس کی زمانے میں اہمیت ہے یا نہیں، اگر اہمیت نہیں ہے تو ٹھیک ہے، جو کام آپ کرتے ہیں، دوسرا بھی کرتا ہے، تیسرا بھی کر سکتا ہے، بہت سے ہیں کر سکتے ہیں، تو اِس کام کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ لیکن اِس کے برعکس جب پتا چلتا ہے کہ یہ کام جو آپ کر رہے ہیں بڑا اہم ہے، بڑا اہم ہے عام نہیں ہے، خاص ہے، تو پھر آپ کو کرنا چاہئے، اِس لئے کہ یہ ایک اشارہ ہوتا ہے خدا کی طرف سے کہ آپ کو شاید اسی مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

ایک اور وجہ اِس کی یہ ہے، کہ جہاں لوگ اسماعیلیوں کو یہ سمجھتے ہیں کہ اسماعیلی قرآن پر عمل نہیں کرتے ہیں، وہاں ہم یہ ثابت کیوں نہیں کریں کہ قرآن بھی اور صاحبِ قرآن بھی ہمارا ہے، اور اِس کا ثبوت یہ ہے کہ اِس کے اندر جو بھید ہے، جو حکمت ہے، جو تاویل ہے، جو حقیقت ہے اُس کو امام اور اُس کے لشکر جس طرح جانتے ہیں، اِس طرح کوئی نہیں جانتا، بہت سے معنوں میں اور بہت سی مثالوں میں۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ کسی بھی ہوشمند یا خواندہ اسماعیلی کو بات کرنی ہے اپنے برادر مسلمانوں کے ساتھ تو قرآن سے بات کرنی چاہئے اور جہاں لوگ قرآن سے بات کرتے ہیں وہاں ہم چپ رہیں، تو یہ ہماری بڑی مفلسی ہوگی۔ ابھی صبح جو بات ہوئی تھی، خدا نے لوہا (۲۵:۵۷) اِس لئے بھیجا ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ کون اُس کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے، اِس کام کی اتنی زیادہ اہمیت ہے، کہ یہ کام اللہ کی مدد قرار پاتا ہے اور اُس کے بھیجے ہوئے تمام رسولوں کی مدد ہوتی ہے اِس سے، تو کیوں نہ کریں۔ بہر حال، میں نے اپنی اِس گفتگو میں ایک طرف سے یہ بتا دیا کہ ہم کس طرح قرآن کے خاص خاص مطالب کو (cover) کر سکتے ہیں اور دوسری طرف سے اِس کام کی اہمیت کے بارے میں کچھ بات کی، اب ہم شاید دوسری باتیں کریں گے اور اِس میں آپ بھی کوئی

مشورہ دیں، آپ یقین دلائیں کہ ہم یہ قرآن پر ریسرچ ورک کر سکتے ہیں یا نہیں، تو مددگار خداوند ہے، ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم حرکت کریں، کوشش کریں، تو ہماری اِس نیک نیتی سے کچھ تو ملے گا اور کچھ تو خداوند راضی ہوگا۔

اِس میں آپ سب یک دل ہو کے کوشش کریں، اِس میں ایک دو پر نہیں ہے، آپ سب پر ہے کہ اِس کام کو آگے بڑھانے کے لئے آپ ذوق سے، شوق سے کام کریں، اپنے استادوں کو مجبور کریں کہ وہ آپ کے ذوق کو دیکھ کر حرکت میں آئیں، کام کریں۔ آپ خاموش ہو جائیں گے اُن کو تو بہانہ مل جائے گا کسی بھی مرحلے پر، اپنی کمزوری کو اور اپنی تھکان کو، آپ کی اِس بے حسی میں چھپا کے وہ خاموش ہو جائیں گے، اِس لئے یہ ضروری ہے کہ آپ حرکت میں آئیں، آپ کام کریں، اُن کو مجبور کریں، وہ بھی کام کریں گے آپ کے ساتھ مل کر۔ میں فی الحال اتنی گفتگو کے بعد رُک جاؤں گا اور میں دیکھوں گا کہ آپ کا اِس میں کیا خیال ہے، کیا مشورہ ہے، ویسے تو ہم نے اپنی طرف سے قرآن کی سات منزلوں کے لئے سات گروپ بنائے۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: نجمہ بیگ   نظرِ ثانی: اکبر علی   پرُوف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ ماعون (۱۰۷) کی تاویل، یتیم کی حکمت، سورۂ جنّ (۷۲) کی حکمتیں

کیسٹ نمبر: Q-23 تاریخ: ۹/ستمبر/۱۹۸۲ کراچی

سورۂ ماعون (۱۰۷) کی تاویل:

تاویل کا ایک بنیادی اُصول یہ ہے کہ تاویل کے لئے قرآن کے لغوی معنی یعنی (literal meaning) چاہیئے۔ یہ بہت ہی ضروری ہے کہ تاویل کرنے والا قرآن کے لغوی معنی کو سمجھے اور اگر اُس نے کہیں ترجمہ میں سے محاورے کو لیا تو تاویل کے لئے مشکل ہوجائے گی، تو اِس لئے تاویل کے لئے ایسے ترجمے کی ضرورت ہے جس میں کہ تحتُ اللفظ اور لغوی معنی بیان کئے ہوں، اِس لئے کہ تاویل کا تعیّن بنیادی معنی پر ہوتا ہے، اور ایسا نہیں کہ دوسرے یا تیسرے یا چوتھے مرحلے پر جو معنی میں تبدیلی آتی ہے اُس کے مطابق تاویل ہو، یہ بات نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن میں جو یتیم کا لفظ آیا ہے، اِس کی تاویل کے متعلق آپ کو تعجّب ہوگا کہ یتیم کی تاویل امام ہیں، اور حالانکہ بعد کے محاورے سے عجیب لگتا ہے کہ یتیم کی تاویل امام ہے، اِس لئے کہ بعد کا جو مطلب ہے یا بعد کے جو معنی ہیں، وہ بدلے ہوئے ہیں اور یتیم (literal sense) میں یکتا کو کہتے ہیں، چنانچہ فارسی زبان میں درِّ یتیم اُس موتی کو کہا جاتا ہے جو سیپ میں سے ایک اکیلا نکلتا ہے۔ آپ نے یہ کہانی سنی ہوگی کہ دریا میں سے جو موتی نکالتے ہی، تو اُس وقت اگر سیپ میں سے ایک اکیلا موتی نکلتا ہے، تو اُس کو درِّ یتیم کہا جاتا ہے یعنی یکتا اور اکیلا موتی، بعد میں یتیم اُس بچّے کو بھی کہا جانے لگا جس کے ماں باپ نہیں ہوتے ہیں، اور اِس لئے قرآن کے اندر یتیم امام کو کہا جاتا ہے، کہ اُس کے ماں باپ نہیں ہیں یعنی وہ بغیر ماں باپ کے ہیں اور اِس سے پہلے کہ وہ یکتا ہیں، اُس کے ماں باپ بنیاد ہی سے نہیں، کہ وہ ماں باپ کے بغیر ہے، اِس معنی میں بھی لیکن اِس سے پہلے بنیاد میں وہ یکتا ہے، اِس لئے یتیم کی تاویل امام ہیں آپ وجہ دین کو لیجئے تو اُس میں آپ کو یہ مطلب ملے گا (عنوان: خُمس کی تاویل، صفحہ نمبر ۲۹۲) اب میں ایک چھوٹی سی سورت اِس سلسلے میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ اَرَاَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ○ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ
الۡیَتِیۡمَ ○ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ○ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ ○ اَلَّذِیۡنَ ہُمۡ عَنۡ صَلَاتِہِمۡ

سَاهُوْنَ ○ اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ○ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ‘‘ (۱۰۷: ۱-۷)

اب اِس کا لفظی ترجمہ: شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، بھلا تم نے اُس شخص کو دیکھا جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے، یہ وہی بدبخت ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لئے لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا، تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں اور برتنے کی چیزیں عاریت نہیں دیتے۔ یہ لفظی ترجمہ ہوا، اب اِس کی تاویل جو کچھ ممکن ہے۔

بھلا تم نے اُس شخص کو دیکھا جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے۔ اب روزِ جزا کو جھٹلانا دو طرح سے ہے، ایک یہ کہ قیامت سے قطعی طور پر انکار کرنا، ایک یہ کہ روزِ جزا یا کہ قیامت کی حقیقت کو نہ سمجھنا۔ آپ ضرور مانیں گے، کہ قیامت کو جھٹلانے کا واقعہ دوسری صورت میں ہے، یعنی قیامت کی حقیقت کو، روزِ جزا کی کیفیت کو نہ سمجھنے کی صورت میں ہے، اور دوسری بات اِس سلسلے کی یہ ہے کہ قیامت ایک فعل ہے قائم کا، اور قائم کو نہ پہچاننا ہی قیامت کی تکذیب ہے، اِس لئے کہ تاویل کی زبان میں آخرت پر ایمان لانا قائم القیامت پر ایمان لانا ہے اور قیامت کے دن کو جھٹلانا قائم کو جھٹلانا ہے، ورنہ کوئی بھی شخص جس کو خدا پر ایمان ہو خواہ کسی دین سے تعلق رکھتا ہو، وہ تو ظاہر میں قیامت کے لئے مکفّر ہے۔ ’’فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ‘‘ (۱۰۷: ۲) یہ وہی بدبخت ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ تاویل میں یعنی امام کو اِس کے مقام سے ہٹانا چاہتا ہے، یعنی وہ اِس کے لئے اقرار نہیں کرتا ہے، کہ امام اپنی جگہ پر امام ہے، نیز یہ کہ وہ اپنے دل میں نورِ امامت کو نہیں آنے دیتا، امامت کا عقیدہ نہیں رکھتا ہے، اِس معنیٰ میں وہ امام کو دھکا دیتا ہے۔ ’’وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ‘‘ (۱۰۷: ۳) جہاں یتیم کی تاویل امام ہیں، وہاں پر مسکین کی تاویل حجّت ہے، تو وہ حجّت کے علم کے لئے ترغیب نہیں کرتا ہے، حجّت کے علم کے لئے لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا ہے۔ مسکین کی تاویل ذریعۂ سکون، ذریعۂ تسکین، وسیلۂ تسلّی حجّت ہے اور یتیم یعنی یکتا، یگانہ امام ہیں، پس ’’وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ‘‘ کا مطلب ہے، کہ ایسا شخص جو امام کو نہیں چاہتا ہے، وہ حجّت کو بھی نہیں چاہتا اور اُس کے علم کی طرف لوگوں کو شوق نہیں دلاتا تشویق نہیں کرتا۔

’’فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ‘‘ (۱۰۷: ۴) تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے، ایسے نمازیوں کی بربادی ہے۔ ’’اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ‘‘ (۱۰۷: ۵) جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ ’’اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ‘‘ (۱۰۷: ۶) جو دکھاوے کرتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں۔ اب ان تینوں آیتوں کو ملانے سے تاویل کا تعیّن ہوتا ہے، سب سے پہلے یہ کہ خدا کچھ لوگوں کو ’’مُصَلِّيْنَ ‘‘ کا نام دیتا ہے اِن کو نمازی کہتا ہے، کہ اگر یہ لوگ ظاہری نماز نہ کرتے ہوتے، تو خدا اُن کو نمازی نہ فرماتا، وہ ہیں ظاہر میں نمازی۔ پھر اِس کے ساتھ ساتھ اُن کو ’’سَاهُوْنَ ‘‘ کہتا ہے، غافل کہتا ہے اور اِس کے بعد کہتا ہے کہ وہ ریاکاری کرتے ہیں۔ اِس سے نہیں لگتا ہے کہ وہ ظاہر میں نماز نہیں کرتے ہیں، نماز کرتے ہیں لیکن غافل

اِس معنیٰ میں ہیں، کہ نماز کے اندر جو اشارے ہیں، نماز کی جو تاویل ہے، نماز کی جو حکمت ہے، وہ اِس سے غافل ہیں۔ چونکہ امامت کا موضوع چلتا تھا، چنانچہ نماز کے اندر، سجدے کے اندر، رُکوع کے اندر اور تمام چیزوں میں آپ دیکھتے ہیں اسماعیلی تاویل کی کتابوں سے امامت کا ذکر ہے، حجّت کا ذکر ہے اور رسولؐ کے بعد امام کی جانشینی کا ذکر ہے، تو اِن اشاروں کو، اِن کنایوں کو اور اِن تاویلات کو وہ نہیں سمجھتے ہیں۔ اِس واسطے خداوندِ عالم "وَیل" کہتا ہے: "فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ" (۱۰۷:۴) بربادی ہے اُن نمازیوں کے لئے۔ حالانکہ لوگوں کا عام عقیدہ تو یہ ہے کہ جو بھی نماز پڑھے اور جس طرح سے بھی پڑھے بس اُس کو نجات مل جائے گی۔ لیکن خدا نے یہاں "وَیل" کہا اور "وَیل" ایک ایسا لفظ ہے کہ اِس میں بربادی کے معنی ہیں۔ یعنی اُس کی کوئی ہستی نہیں بنتی ہے، اُس کو کوئی چیز نہیں ملتی ہے، اُس کی کوشش رائیگان جاتی ہے وغیرہ، ایسے معنی ہیں تو ترجمہ کرنے والے نے بھی ٹھیک ترجمہ کیا ہے، تو ایسے نمازیوں کی ایک خرابی ہے، خرابی اور بربادی کسی چیز کا نیست و نابود ہو جانا۔ "فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ" اُن نمازیوں کی بربادی ہے، خرابی ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔ اپنی نماز سے اِن الفاظ سے لگتا ہے کہ وہ نماز تو کرتے ہیں اور سچے نماز کرنے کے لئے تاکید کرتی ہے یہ آیت "اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ" (۱۰۷:۶) یہ تو ریاکاری کرتے ہیں یعنی نماز ایک صورت سے پڑھتے ہیں لیکن اُس کے اندر جو حکمت رکھی ہوئی ہے اور نماز کی تاویل سے سراسر اُس سے وہ غافل ہیں۔ "وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ" (۱۰۷:۷) اور وہ برتنے کی چیزیں عاریت نہیں دیتے، تو یہ ایک مختصر سی سورت تھی جو یتیم اور مسکین کی تاویل کے سلسلے میں بیان کیا گیا۔

<u>سورۂ جنّ (۷۲) کی تاویلات</u>

اِس میں ہم صرف ترجمہ پڑھتے ہیں۔ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" "اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دو کہ میرے پاس وحی آئی ہے کہ جنّوں کی ایک جماعت نے اِس کتاب کو سنا، تو کہنے لگے کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا۔ اب یہاں ٹھہر کے ہم بحث کرتے ہیں کہ جہاں جنّوں کی ایک جماعت نے قرآن کو سنا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ قرآن جنّوں کی اِس جماعت نے ظاہر میں سنا یا باطن میں سنا۔ کیونکہ ہم کو جاننا ہے کہ کس طرح جنّوں کی اِس جماعت نے قرآن کو سنا۔ آیا قرآن کی کوئی باطنی حیثیت ہے یا انہوں نے محض قرآن کے ظاہر کو سنا آنحضرتؐ کے پڑھتے ہوئے یا کسی اصحاب کے قرآن کو پڑھتے ہوئے یا باطنی طور پر قرآن کی کوئی حیثیت ہے جہاں پر قرآن زندہ اور موجود ہے اور جنّ چونکہ ایک لطیف مخلوق ہے ایک رُوحانی مخلوق ہے، تو اُس نے رُوحانیت میں قرآن کو سنا۔

ہم اِس سوال کا اِس طرح سے جواب دیں گے، کہ اِن جنّات نے قرآن کو رُوحانیت میں سنا، باطن میں سنا۔ چونکہ

قرآن بحالتِ رُوحانی ایک زندہ کتاب ہے، ایک نور ہے، ایک بولتی کتاب ہے، ایک رُوح ہے تو چونکہ جنّ بھی ایک غائب مخلوق ہے، ایک لطیف شیٔ ہے لہٰذا اُس نے اپنے میدان میں قرآن کو رُوحانی حیثیت میں سنا جو بھلائی کا رستہ بتاتا ہے، تو یہ قرآن کی تعریف ہوتی ہے تو ہم اِس پر ایمان لے آئے۔ جنّات کہتے ہیں اور ہم اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گے، تو اِس سے پتا چلتا ہے کہ جنّات میں بھی مسلمین اور مومنین ہیں۔ ”وَاَنَّهٗ تَعَالٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا“ (۷۲:۳) اور یہ کہ ہمارے پروردگار کی عظمت بہت بڑی ہے، وہ نہ بیوی رکھتا ہے نہ اولاد۔ اب اِس میں جد جو ہے ایک اصطلاح ہے، ایک فرشتہ ہے جسکا اسماعیلی لٹریچر میں اِس کا ذکر آتا ہے جد، فتح، خیال، یہ وہی جد ہے اور اِنہوں نے اِس کا ترجمہ شان یا عظمت کیا ہے، تو ٹھیک ہے، خدا کی عظمت اور شان بھی ایک زندہ شیٔ اور ایک زندہ مخلوق ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا جد ایک فرشتہ ہے جو خدا کی شان ہے اور اُسی مقام پر اور اُسی درجے میں خدا کی کوئی بیوی نہیں اور اُس کی کوئی اولاد نہیں۔ کیونکہ ہم جس طرح مونوریالزم کا نظریہ رکھتے ہیں، اُس کے مطابق خدا ایک (unity) ہے، خدا ایک توحید ہے، خدا ایک وحدت ہے، اُن بڑے درجات کی ایک (unity) ہے۔ مثلاً پیر ناصرِ خسروقؔ نے اپنی کتاب میں شاید ”زادالمسافرین“ میں اور ”وجہ دین“ میں بھی یہ ذکر فرمایا ہے کہ عقلِ کُل، نفسِ کُل، ناطق، اساس اِن چار اُصول کی جو (unity) ہے یعنی اِن کے آپس میں جو وحدت ہے وہی خدا کی وحدت ہے۔ ہم کئی بار اِس پر بحث کر چکے ہیں کہ: ”قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ“ (۱۱۲:۱) کے دو امکانی معنی ہیں، ایک یہ کہ تمام مخلوقات کی نفی کر کے، تمام موجودات کی نفی کر کے اُس میں سے ایک وُجود کو تسلیم کر لینا اور دُوسری توحید اِس طرح سے ہے، کہ وہ توحید بہت سی ہستیوں کے درمیان ہے یا کہ بہت سی ہستیوں پر حاوی ہے۔ مثلاً کسی بھی مثال میں ہم کہتے ہیں کہ ہم یہاں جتنے بیٹھے ہیں ہم ایک ہیں تو اِس معنیٰ میں بھی ایک وحدت کا اطلاق ہوتا ہے، اور دوسرا یہ کہ ہم میں سے کسی ایک کو لیتے ہیں کسی مثال میں کسی کام کے لئے کہتے ہیں کہ یہی ایک ہے، تو دونوں طرح سے ایک کا اطلاق ہوتا ہے اور پہلی مثال میں جو ہم نے کہا کہ ہم سب ایک ہیں یہ مونوریالزم کی مثال ہے، اِسی طرح: ”قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ“ میں تمام موجودات کے ایک ہونے کا ذکر ہے۔ چنانچہ حدودِ دین کی جو وحدت ہے، حدودِ دین کی جو (unity) ہے یا جو (unification) ہے وہ خدا کی وحدت ہے اور اِس لئے یہاں خدا کی شان اور اُس کی عظمت بہت بلند ہے یعنی اُس کی توحید اور وہاں پر خدا کی کسی بیوی کا اور اولاد کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہے۔
پھر ارشاد ہے اور جس کا ترجمہ یہ ہے کہ: اور یہ کہ ہم میں سے بعض بیوقوف خدا کے بارے میں جھوٹ افترا کرتے ہیں (۷۲:۴) تو وہ جنّات اپنے احوال کی ترجمانی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سب جنّات ایک جیسے نہیں ہیں بلکہ کچھ خدا پر جھوٹ افترا کرنے والے ہیں۔

پھر فرمایا جاتا ہے، کہ ہمارا یہ خیال تھا کہ انسان اور جنّ خدا کی نسبت جھوٹ نہیں بولتے ہیں (۷۲:۵) تو جس طرح

تکذیب کی دو قسموں کا ذکر ہوا، تو یہاں وہی بات ہے کہ تکذیب یعنی جھٹلانا دو طرح سے ہے، ایک عام جھٹلانا لیکن یہ ناممکن ہے عام طور سے کوئی کہے کہ خدا جھوٹ بولتا ہے۔ پہلے خدا کو تسلیم کرے، خدا کے لئے اقرار کرے اور پھر کہے کہ خدا جھوٹ بولتا ہے، اِس طرح سے تکذیب کوئی نہیں کرتا یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ جہاں بھی خدا کا تصور ہوتا ہے اور جو لوگ یا جو فرد خدا کو مانتا ہے، تو ایک اعلیٰ درجے میں مانتا ہے اور خدا کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا ہے یہ کوئی منطق نہیں بنتی ہے جو کہ کہے کہ خدا جھوٹ بولتا ہے۔ اِس کے برعکس خدا کو جھٹلانے کی کوئی دوسری صورت ہے، وہ یہ کہ خدا کی حقیقتوں کو نہ سمجھنا خدا کو جھٹلانا ہے، نیز یہ کہ خدا کی تاویل امام ہے جس طرح آپ عام طور پر مانتے ہیں اور آپ نے اِس اُصول کو سمجھ رکھا ہے کہ خدا کی تاویل امام ہے تو امام جو کچھ فرماتا ہے اُس کو لوگ جھٹلاتے ہیں، اُس کو برحق نہیں مانتے ہیں، وہ خدا کو جھٹلانا اِس طرح سے بھی ہوتا ہے۔ ”وَاَنَّہٗ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْھُمْ رَھَقًا“ (۶:۷۲) اور یہ کہ بعض بنی آدم بعض جنّات کی پناہ کو طلب کرتے تھے، اِس سے اُن کی سرکشی اور بڑھ گئی، تو جنّات خود کہتے ہیں کہ یہ بات درست نہیں ہے کہ کچھ انسان یعنی بنی آدم جنّات سے مدد چاہتے ہیں اور یعنی خدا کے سوا کچھ دوسری ہستیوں سے یا رُوحوں سے تو یہ بات درست نہیں ہے۔ جنّات کی زبان سے اِس بات کی تردید ہوتی ہے، کہ ایک ذات کے سوا کسی سے کوئی مدد کوئی پناہ درست نہیں ہے۔ ”وَاَنَّھُمْ ظَنُّوْا کَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّبْعَثَ اللّٰہُ اَحَدًا“ (۷:۷۲) تو جس طرح بعض انسان مر کر دوبارہ زندہ ہونے کو نہیں مانتے ہیں اِسی طرح جنّات بھی بعض ایسے ہیں جو کہ مر کر جی اُٹھنے کا تصور نہیں کرتے ہیں۔

”وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنَاھَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَشُھُبًا“ (۸:۷۲) اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اُس کو مضبوط چوکیداروں اور انگاروں سے بھرا ہوا پایا۔ آپ نے پہلے کبھی یہ سن لیا ہے، کہ رُوحانیت کی زمین کے اوپر جو آسمانِ یکم ہے اُس کو خداوند نے کچھ رُوحانی چوکیداروں سے محفوظ کیا ہے، کہ شیاطین اور جنّات وغیرہ آسمان کی طرف پرواز کر کے ملاءُ الاعلیٰ کی طرف نہ جاسکیں، تو پھر اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی آپ کو بتایا گیا تھا کہ لوگوں کی گمراہی کی حد یہ نہیں ہے، کہ وہ ظاہر میں گمراہ ہو جاتے ہیں بلکہ وہ باطن تک جاسکتے ہیں اور زمین رُوحانیت کو پہنچتے ہیں اور وہاں سے آسمانِ رُوحانیت کی طرف شیاطین وغیرہ پرواز کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن خداوندِ عالم کی طرف سے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ پہلے آسمان پر انگاروں اور شعلوں کا تعینات ہے، تو وہ شعلے اُن شیاطین پر برس پڑتے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ شیاطین وہاں سے لوٹ آتے ہیں، اور یہاں پر وہی بات ہے کہ جنّات اپنی زبان سے اِس واقعے کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے آسمانِ رُوحانیت کو چھوا اور ٹٹولا تو اُس کو مضبوط چوکیداروں اور انگاروں سے بھرا ہوا پایا یعنی کہ اُوپر جانے کے لئے کوئی رستہ نہیں تھا۔

”وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْـهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْـعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِـعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَـهٗ شِهَابًا رَّصَدًا“(۹:۷۲)
اِس میں یہ ذکر بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ظہور سے پہلے کاہن ہوا کرتے تھے، جن کی رسائی کچھ کچھ اُن شیاطین سے ہوتی تھی اور شیاطین کچھ کچھ پرواز میں کامیاب ہوتے تھے اور ملاءُ الاعلیٰ جو بڑے بڑے فرشتے ہیں وہ خداوندِ عالم کی مصلحت اور جو کچھ دُنیا میں ہونے والا ہے اُس کے متعلق بات چیت سنتے تھے اور آپس میں گفتگو کرتے تھے، دنیا کے اندر کیا کیا واقعات رونما ہونے والے ہیں، تو یہ شیاطین ملاءُ الاعلیٰ کی طرف پرواز کرکے جاتے تھے اور اِس کی تفصیل کچھ اِس طرح سے ہے کہ عرشِ اعلیٰ میں جو ملاءُ الاعلیٰ ہیں جو فرشتوں کے سردار ہیں تو رُوحانی طور پر عرشِ اعلیٰ اُس میں ملاءُ الاعلیٰ خدا کے حضور میں ہے تو خداوندِ عالم ایک نورانی صورت میں جلوہ فرما ہیں تو وہ کچھ دنیا کے اندر جو کچھ ہونے والا ہے اُس کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے تو اُس کا تذکرہ ملاءُ الاعلیٰ کرتے ہیں اور ملاءُ الاعلیٰ جو عرشِ اعلیٰ پر ہیں تو اِن کی گفتگو کو کرسی والے سنتے ہیں پھر کرسی والے یہ گفتگو کرتے ہیں اور کرسی والوں کی گفتگو آسمانِ ہفتم کے جو فرشتے ہیں وہ کرتے ہیں اور پھر اُن کی گفتگو ششم آسمان کے فرشتے کرتے ہیں اور یہ پنجم آسمان کے فرشتے سنتے ہیں اور آپس میں گفتگو کرتے ہیں، اِس طرح کرتے کرتے آسمانِ اوّل کے فرشتے جب آپس میں خدا کے بھیدوں سے متعلق کچھ باتیں کرتے ہیں، تو کاہن کو مدد پہنچانے کے لئے یہ شیاطین اُڑا کرتے ہیں اور کچھ تو بات وہ اُچک لاتے ہیں اور کچھ نامرادی ہوتی ہے۔ چونکہ اُن پر شہابِ ثاقب برستے ہیں (۹:۷۲)، (ٹوٹنے والے ستارے) رُوحانیت میں، ظاہر میں نہیں لیکن کہتے ہیں کہ جب سے آنحضرتؐ کا ظہور ہوا اور اسلام دُنیا والوں کے سامنے پیش کیا گیا، تو اُس وقت سے خداوندِ عالم کی طرف سے سخت پابندی لگی اور جو کاہن زمانۂ قدیم میں جو کاہن لوگ تھے، وہ بے بس ہوگئے اور اُس میں سوچنے کا مقام ہے، کہ یہ بعد میں اِس چیز پر پابندی کیوں لگی، وغیرہ، تو یہ ایک سوال ہے۔

بہر حال بحیثیتِ مجموعی یہ بات صحیح ہے کہ رُوحانیت میں یہ واقعات ہوتے ہیں اور شیاطین وہ لوگ ہیں جو گمراہ ہیں اور شیاطین وہ لوگ ہیں جو امام کے برعکس ہیں، تو وہی لوگ کسی بھی صورت میں تصوّف کے بہانے سے اور رُوحانیت کے بہانے سے رُوحانیت کی زمین تک رسا ہو جاتے ہیں اور رُوحانیت کے آسمان تک پرواز کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں لیکن چونکہ وہ شیاطین ہیں اِس قرآن کے ارشاد کے مطابق، تو وہ وہاں سے ناکام و نامراد ہو کے لوٹ جاتے ہیں اور یہ کہ ہمیں معلوم نہیں کہ اِس سے اہلِ زمین کے حق میں بُرائی مقصود ہے یا اُن کے پروردگار نے اُن کی بھلائی کا ارادہ فرمایا (۱۰:۷۲) تو یہ قائل ہو جاتے ہیں جنّات بحیثیتِ مجموعی جنّات کی طرف سے ترجمانی کرتے ہیں کہ اگرچہ ہم آسمان کی بلندیوں کی طرف پرواز کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور جس میں شعلوں سے مار کے ہم کو واپس کیا جاتا ہے اور اِس میں کوئی آدھی بات ہم کو آتی ہے، تو اِس سے کچھ گزارہ نہیں ہوتا ہے کہ ہم دُنیا والوں کے بارے میں کچھ جان سکیں یا بتا

سکیں کہ دُنیاوالوں کے لئے خداا کاارادہ کیاہے اوراُن کے سامنے کیا آنے والا ہے،تو یہ ہم نہیں جانتے ہیں (۷۲:۱۰)اور یہ کہ ہم میں کوئی نیک ہیں اور کوئی اورطرح کے [یعنی] ہمارے کئی طرح کے مذہب ہیں (۷۲:۱۱)یعنی جنّات کے اندر مختلف طبقات ہیں اور مختلف گروہ ہیں،اور یہ کہ ہم نے یقین کرلیاہے کہ ہم زمین میں خواہ کہیں ہوں خدا کو ہرا نہیں سکتے اور نہ بھاگ کراُس کوتھکا سکتے ہیں (۷۲:۱۲) تو اِس بات کے قائل ہوگئے،کہ وہ خدا کے پنجۂ قدرت سے کہیں نہیں جاسکتے ہیں۔ جب ہم نے ہدایت سنی اِس پر ایمان لے آئے تو جوشخص اپنے پروردگار پر ایمان لاتاہے،تو اُس کو نہ نقصان کا خوف ہے نہ ظلم کا (۷۲:۱۳) یہ کہ ہم میں بعض فرمانبردار ہیں اور بعض نافرمان گناہ گار،تو جوفرمانبردار ہوئے وہ سیدھے رستے پر چلے اور جوگنہگار ہیں وہ دوزخ کا ایندھن بنے (۷۲:۱۴)۔

اور اے پیغمبر! یہ بھی اِن سے کہہ دوکہ اگر یہ لوگ سیدھے رستے پر رہتے تو ہم اُن کے پینے کو بہت سا پانی دیتے (۷۲:۱۵)۔ یہاں پر بہت عجیب بات ہے وہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشادفرماتا ہے آنحضرتؐ سے کہ حضورؐ بندوں سے فرمائیں،کہ اگرلوگ رستے پر قائم رہیں،تو خداوندِ عالم اُن کو بہت سا پانی پلائے گا۔ظاہر میں دیکھا جائے تو ایسا نہیں ہے کہ جو پرہیزگار ہے یا جوعبادت گزار ہے اُس کو بہت زیادہ پانی ملتا ہو اور جوگنہگار ہو اُس کو پانی نہیں ملتا ہو،ایسے کوئی معنی نہیں بنتے ہیں اور یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے سوائے تاویل کے،اور تاویل اِس کی یہ ہے کہ پانی علم کی مثال ہے اور یہ صحیح ہے کہ جو دین کے رستے پر قائم ہوتو اُس کو رُوحانی علم ملا کرتا ہے اور یہ علم کا پانی خداوندِ عالم اور زیادہ پلانے اور زیادہ دینے کے لئے وعدہ فرماتا ہے،تو یہ بات صحیح ہے۔تاکہ اِس سے اُن کی آزمائش کرے اور جوشخص اپنے پروردگار کی یاد سے منہ پھیرے گا وہ اُس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا (۷۲:۱۶۔۱۷)۔درست ہے کہ خداوندِ عالم یہ علم آزمانے کے لئے دیتا ہے،تو اِس کی آزمائش دوطرح سے ہے اور جس کو علم دیا جاتا ہے اُس سے بھی آزمائش ہے اور جن کو نہیں دیا جاتا ہے اُن سے بھی آزمائش ہے،اور یہ فرمانا کہ جو اپنے پروردگار کی یاد سے منھ پھیرے گا خدا اُس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا،یہ صحیح ہے۔

"وَاَنَّ الۡمَسَاجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا"(۷۲:۱۸)اور یہ کہ مسجدیں خاص خدا کی ہیں تو خدا کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کرو۔مساجد کے دو معنی ہیں یہاں،ایک معنی جائے عبادت ہے،ایک معنی اِس کے عبادتیں ہیں۔قرآن میں آپ کو مسجد کے تین معنی ملیں گے،ایک مسجد اسم یا اسم اعظم اور مسجد کے دوسرے معنی عبادت اور مسجد کے تیسرے معنی جائے عبادت۔ یہاں مسجد بھی ہے اور عبادت بھی کہ عبادات خدا کے لئے ہیں اور خدا کے ساتھ کسی اور کو نہ ملانا۔"وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبۡدُ اللّٰہِ یَدۡعُوۡہُ کَادُوۡا یَکُوۡنُوۡنَ عَلَیۡہِ لِبَدًا"(۷۲:۱۹) اور جب خدا کے بندے یعنی محمدؐ اِس عبادت کو کھڑے ہوئے تو کافر اُن کے گرد ہجوم کرلینے کو تھے۔کہہ دوکہ میں تو اپنے پروردگار کی عبادت کرتا ہوں کسی کو اِس کا شریک نہیں بناتا (۷۲:۲۰) یہ بھی کہہ دوکہ میں تمہارے حق میں نقصان ونفع کا کچھ اختیار نہیں رکھتا (۷۲:۲۱)

یہ بھی کہہ دو کہ خدا کے عذاب سے مجھے کوئی پناہ نہیں دے سکتا اور میں اِس کے سوا کہیں جائے پناہ نہیں دیکھتا (۷۲:۲۲) خدا کی طرف سے احکام کا اور اِس کے پیغاموں کا پہنچا دینا ہی میرے ذمّے ہے اور جو شخص خدا اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو ایسوں کے لئے جہنم کی آگ ہے ہمیشہ ہمیشہ اُس میں رہیں گے (۷۲:۲۳) یہاں تک کہ جب یہ لوگ وہ دن دیکھ لیں گے جس کا اِن سے وعدہ کیا جاتا ہے تب اُن کو معلوم ہو جائے گا کہ مددگار کس کے کمزور اور شمار کن کا تھوڑا ہے، کہہ دو کہ جس دن کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے میں نہیں جانتا کہ وہ عنقریب آنے والا ہے یا میرے پروردگار نے اِس کی مدّت دراز کر دی ہے (۷۲:۲۴۔۲۵)۔

اِس کے بعد ایک بہت اہم آیت سامنے آتی ہے اور جس میں زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے "عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا" (۷۲:۲۶) وہی غیب کی بات جاننے والا ہے وہ کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا۔ "اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ" (۷۲:۲۷) ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے وہ اُس کو غیب کی باتیں بتا دیتا ہے۔ "فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا" (۷۲:۲۷)، تو خداوند کا یہ قانون ہے کہ ہر پیغمبر کے آگے اور پیچھے نگہبان مقرّر کر دیتا ہے۔ سُن لیا آپ نے کہ ہر پیغمبر کے آگے کوئی ہوتا ہے اور اُس کے بعد کوئی ہوتا ہے، یہ نہیں بتایا کہ آگے کون ہوتا ہے اور پیچھے کون ہوتا ہے؟ کوئی فرشتہ ہوتا ہے یا بشر لیکن ہوتا ہے ضرور کوئی اور اِس کا اطلاق اُصول کے طور پر اور کلیے کے طور پر ہر پیغمبر پر ہوتا ہے۔ اگر آدم کو پیغمبر مانیں تو اِس اُصول کے مطابق یہ ماننا پڑے گا کہ آدم کے آگے کوئی تھا اور آدم کے پیچھے بھی کوئی تھا۔ اِسی طرح ہر پیغمبر سے آگے اور پیچھے، حتیٰ کہ آنحضرت ﷺ کے آگے اور پیچھے تھے، تو اہلِ ظاہر اِس کے متعلق یہ کہا کرتے ہیں کہ خدا ہر پیغمبر کے آگے اور پیچھے دو فرشتے لگا دیتا ہے لیکن اِس کی کوئی منطق نہیں ہے۔ ہر پیغمبر کے آگے اور پیچھے کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کا ایک سلسلہ چلتا ہے، زنجیر جس طرح کڑی سے کڑی ملی ہوئی ہے زنجیر کی، اِس طرح ہر پیغمبر سے آگے ایک پیغمبر ہے اور اُس کے بعد ایک پیغمبر ہے۔ رہا سوال خاتم النبیّین کا، بے شک کہ جہاں پر خاتم النبیّین پیغمبر ہیں یا امام ہیں تو امام اور پیغمبر اگرچہ نام الگ الگ ہیں لیکن کارِ ہدایت کے لحاظ سے دونوں کا مطلب ایک ہے۔ مراد ہدایت ہے، مراد دین کی روشنی ہے تو اِس دین کی روشنی میں یا ہدایت میں یا تعلیم میں یا آگہی میں یا رہنمائی میں دونوں ایک ہیں اور فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی بڑا پیغمبر ہو تو اُس پر کتاب نازل ہوتی ہے اور امام اُس کتاب کی حکمت کو اور تاویل کو بیان کرتے ہیں۔ بہر حال یہاں پر ہر پیغمبر کے آگے اور پیچھے ایک ایک ہستی مقرّر ہوتی ہے، کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اسلام میں کسی واقعے کی شہادت دو گواہوں سے پوری ہوتی ہے، اِسی طرح ہر پیغمبر نے جو کچھ کارِ نبوّت کو انجام دیا اُس کی شہادت وگواہی دو سے پوری ہوتی ہے کہ ایک آگے ہوتا ہے اور ایک پیچھے ہوتا ہے، تو یہاں پر نبوت کے بعد امامت کے سلسلے کا آغاز کا بھی ذکر ہے۔

''لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسَالٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا''
(۲۸:۷۲) تاکہ معلوم فرمائے کہ اُنہوں نے یعنی پیغمبروں نے اپنے پروردگار کے پیغام پہنچا دیئے ہیں اور یوں تو اُس نے اُن کی سب چیزوں کو ہر طرف سے قابو کر رکھا ہے اور ایک ایک چیز گن رکھی ہے، تو یہ سورہ جنّ تھا اور مختصراً اِس کی کچھ حکمتیں بیان کی گئیں اور دوسری دفعہ اِس میں سے سوالات جب دوسرے سب (students) ہوں گے تو سوالات جتنے بھی ہوسکیں کرنا۔

ٹائپنگ: ثناوزیرعلی نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ تحریم کی چند حکمتیں-اصل میں واصل ہو جانا

کیسٹ نمبر: Q-24   تاریخ: ۲۳ر ستمبر ر ۱۹۸۲ کراچی

[اصل] میں واصل ہو جانا(last stage) معراج ہے، لیکن دوسری طرح سے دیکھا جائے تو یہ (last stage) نہیں ہے۔ اِس لئے کہ اصل میں واصل ہو جانا تو اگر ہم رُوح کی لاانتہا زندگی کو دیکھتے ہیں، تو کئی دفعہ [روح] اصل میں واصل ہو چکی ہے اور ہوتی رہے گی، اور معراج ایک ایسی چیز کو کہنا چاہئے، ایک ایسے مقام کو کہ وہاں پر جاکے دیکھ کے آئے کیونکہ آنحضرتؐ کی معراج کی مثال کچھ اِس طرح سے ہے کہ حضورِ معراج پر گئے اور پھر دُنیا کی طرف لوٹ آئے، یعنی معرفت کے بہت سارے خزانوں کو لے کر آئے اور انسانوں کو فائدہ دینے کے لئے آئے۔ اسی طرح اصل معراج یہ ہے کہ بندۂ مومن معرفت کے خزانوں کو لے کر دُنیا والوں کی طرف لوٹے اور لوگوں کو فائدہ پہنچائے اور اصل میں واصل اور معراج دونوں میں فرق ہے۔ واصل کا تصوّر عوام کے نزدیک کچھ اسطرح سے ہے کہ رُوح کو چھٹکارا مل گیا، اور جو اصل مقام ہے اُس میں جاکے سکون حاصل کر لیا، اور اِس کی دوسری اصطلاح یا کہ دوسری (definition) فنافی اللہ بقاباللہ ہے، یہ ہے، تو زندگی میں بھی ہو سکتی اور مرنے کے بعد بھی، کُلّی طور پر بھی ہے اور جزوی طور پر بھی، جزوی طور پر کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں کوئی اچھی رُوحانیت مل گئی، کوئی اچھی عبادت ہوئی، کوئی اعلیٰ عشقِ خدا کا درجہ حاصل ہوا، تو کچھ وقت کے لئے فنا ہو جائے اور پھر اپنے آپ میں آجائے۔ جیسے لوہے کے ایک ٹکڑے کو آگ کی بھٹی میں رکھا جائے، تو کچھ لمحات کے بعد وہ خود انگارا ہو جاتا ہے، آپ جتنی دفعہ چاہیں اُس کو آگ سے الگ کر کے پھر دوبارہ رکھ سکتے ہیں اور آپ چاہیں اُس کو مستقلاً آگ میں رکھ سکتے ہیں، تو یہ ہے فنا، [فنا] اِس طرح سے ہے اور اصل میں واصل بھی کچھ ایسا ہے۔ یہ کہ انسان کہاں سے آیا ہے؟ اللہ کے حضور سے آیا ہے، اب سوال یہ ہے کہ اِس کی کچھ اگلی زندگی بھی ہے یا کہ ابھی ابھی اور اِس دفعہ اِس کی زندگی کا آغاز ہوا، اگر مانا جائے کہ اِس کی بہت ساری زندگیاں بیت چکی ہیں، چونکہ یہ ایک ایسے دائرے پر زندہ ہے، کہ اُس دائرے کی نہ تو کوئی ابتداء ہے اور نہ ہی کوئی انتہا، یعنی انسان اِس دائرۂ غیر متناہی پر ہمیشہ سے رواں دواں ہے، صرف فرق یہ ہے، کہ ہم اُس اگلی یا کہ پچھلی زندگی کو محسوس نہیں کر سکتے ہیں۔ اگر ہم اِس کو مانتے ہیں تو یہ کئی دفعہ اصل میں واصل ہو چکا، تو یہ اُس اصل میں واصل ہونے سے بڑھ کر ہے جو عوام کے نزدیک ہے، یہ ہے۔

قرآن میں معجزۂ قمر کے متعلق صرف شق کا ذکر ہے اور پھٹ جانے کا ذکر ہے،اور دو ٹکڑے جو ہیں وہ تشریح میں ہوسکتا ہے اور جو (orignal) قرآن کی عبارت ہے اُس میں صرف شق ہے،تو شق پھٹ جانے کو کہتے ہیں یا ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو کہتے ہیں ۔میرے نزدیک آنحضرتؐ کا جو معجزہ ہے شقُ القمر کا،وہ اِس مادّی چاند سے رُوحانی چاند کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے میں کہیں زیادہ طاقتور اور تعجّب خیز ہے ۔ہم تو آنحضرتؐ کے ایسے معجزے کو چاہیں گے جو عقلی ہو اور دائمی ہو،کیونکہ جو حسی معجزات ہوتے ہیں وہ فوراً ہی ختم ہو جاتے ہیں،پیغمبر کے معجزات سے انکار کرنے والا کافر ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اُس معجزے کی نوعیت کیا تھی،دوسرے لوگ صرف روایت پر اکتفا کریں گے،ہم اِس معجزے کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور سننے کی نسبت دیکھ کر کہیں زیادہ یقین کریں گے اور پھر اُس کو مادّیت سے اُٹھا کر رُوحانیت میں دیکھیں گے،تو یہ ہے کہ انسان کی رُوح جو ایک مثال کے مطابق چاند ہے،کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں،چونکہ ہمارے نزدیک پیغمبر کی مرتبت یا کہ اُس کا نور رُوحانی کیفیت میں ہمیشہ دنیا میں زندہ ہے،تو لوگوں کے لئے صرف حکایت اور روایت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے،لیکن ہمارے لئے آنحضرتؐ کے کارنامے رُوحانیت میں ریکارڈ ہیں اور زندہ ہیں،اور بہت ساری چیزیں ۔کیونکہ پیغمبروں کے احوال یا اُن کے واقعات رُوحانیت کے ریکارڈ میں محفوظ ہوتے ہیں اور اُن کی شناخت یعنی معرفت انہی واقعات کے مشاہدے سے ہوسکتی ہیں،یہ ہے آپ کے سوال کا جواب ۔ یہاں ہم نوروز کی تاویل دیکھنا چاہتے ہیں یا اُس کا (essence) یا اُس کی رُوح دیکھنا چاہتے ہیں،تو یہ بات بھی رُوحانیت میں ہوگی اور یہ درست ہے،کہ نوروز ایک ایسا جشن ہے،ایک ایسا وقت ہے کہ ماضی میں اِس کے اندر اِس کے آنے کے موقع پر بہت سے عظیم واقعات پیش آئے ہیں،جیسا کہ (articles) میں لکھا گیا ہے،تاہم اِس کا ایک رُوحانی پہلو بھی ہے اور ایک نہیں بلکہ کئی چھوٹے بڑے رُوحانی پہلو ہیں اور ایک بڑا پہلو یہ ہے،کہ کوئی مومن اپنے رُوحانی سفر میں اُس منزل کو پائے جو عہدِ الست سے متعلق ہے،کہ جہاں پر خداوندِ عالم ذرّاتِ ارواح سے سوال فرماتا ہے کہ آیا میں تمہارا پالنہار یعنی پروردگار نہیں ہوں؟ تو وہ رُوحیں کہتی ہیں کہ کیوں نہیں،اور وہاں سے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور یہ ایک نوروز ہے ۔

آج آپ کو ایک سورہ کی کچھ تشریح کرتے ہیں،یہ سورہ سورۂ تحریم ہے جو چھیاسٹھ (۶۶) نمبر کی ہے۔"بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۔شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے" یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ تَبۡتَغِیۡ مَرۡضَاتَ اَزۡوَاجِکَ "اے پیغمبر! جو چیز خدا نے تمہارے لئے جائز کی ہے تم اُس سے کنارہ کشی کیوں کرتے ہو(۶۶:۱)[وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ قَدۡ فَرَضَ اللّٰہُ لَکُمۡ تَحِلَّۃَ اَیۡمَانِکُمۡ وَاللّٰہُ مَوۡلٰىکُمۡ ۚ وَہُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡمُ ○ وَاِذۡ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعۡضِ اَزۡوَاجِہٖ حَدِیۡثًا] فَلَمَّا نَبَّاَتۡ بِہٖ وَاَظۡہَرَہُ اللّٰہُ

عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ''(۶۶:۲۔۳)اور جب پیغمبر نے اپنی ایک بیوی سے ایک بھید کی بات کہی، تو اُس نے دوسری کو بتادی، جب اُس نے اِس کو افشا کیا اور خدا نے اِس حال سے پیغمبر کو آگاہ کر دیا، تو پیغمبر نے اُن بیوی کو وہ بات کچھ تو جتائی اور کچھ نہیں بتائی، تو جب اُن کو جتائی تو پوچھنے لگی کہ آپ کو کس نے بتایا، انہوں نے کہا کہ مجھے اُس نے بتایا جو جاننے والا خبردار ہے۔''اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا وَاِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ''اگر تم دونوں خدا کے آگے توبہ کرو (یعنی آنحضرتؐ کی ایک دو بیویوں سے کہا جاتا ہے)، اگر تم دونوں خدا کے آگے توبہ کرو تو بہتر ہے کیونکہ تمہارے دل کج ہو گئے ہیں، یہ عتاب، یہ (blame) پیغمبرؐ کی دو بیویوں سے متعلق ہے۔''وَاِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ''اور اگر پیغمبر کے ایذا پر باہم اعانت کرو گی، تو خدا اور جبرائیل اور نیک کردار مسلمان اِن کے حامی اور دوستدار ہیں اور اُن کے علاوہ اور فرشتے بھی مددگار ہیں (۶۶:۲۔۳)۔ یہاں پر''صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ'' حضرتِ مرتضیٰ علیؑ کا ٹائٹل ہے، اللہ کا یہ فرمانا آنحضرتؐ کی دو بیویوں سے کہ اگر تم دونوں مل کر رسولؐ کو اذیت دینا چاہو گی، تو خداوند پیغمبر کارساز ہے، مددگار ہے اور جبرائیلؑ بھی اور''صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ''بھی، یہ''صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ''کا مطلب کیا ہے، صالح فاعل کے وزن پر ہے اور یہ اسم فاعل ہے، اور اسم واحد ہے،''صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ''کا مفہوم ہے، مومنین میں اصلاح کرنے والا (reformer)، (reformation) کرنے والا، تو یہ امام کا ٹائٹل ہے،''وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ''اور اس کے بعد فرشتے بھی پیغمبر کے مددگار ہیں۔''عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا''یہ بہت عجیب بات ہے، اگر پیغمبر تم کو طلاق دے دیں، تو عجب نہیں کہ اُن کا پروردگار تمہارے بدلے اُن کو تم سے بہتر بیویاں دے دے، مسلمان، صاحبِ ایمان، فرمانبردار، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار، روزہ رکھنے والیاں، بن شوہر اور کنواریاں (۶۶۔۵)۔ یہ عجیب بات ہے کہ خداوندِ عالم آنحضرتؐ کی کچھ بیویوں کو (blame) فرما رہا ہے۔ اِس کے بعد''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ''مومنو اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آتشِ جہنم سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر تندخو اور سخت مزاج فرشتے مقرّر ہیں۔ جو ارشادِ خدا ان کو فرماتا ہے اِس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم اُن کو ملتا ہے اسے بجالاتے ہیں (۶۶۔۶)۔

یہاں پر ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے مومنین پر یہ فرض کر دیا کہ وہ آتشِ دوزخ سے نہ صرف اپنے آپ کو

بچائیں بلکہ اپنے اہل وعیال کو بھی بچائیں، اِس سے ایک تو یہ پتا چلتا ہے، کہ انسان بہت کچھ کرسکتا ہے، اگر انسان کچھ نہیں کرسکتا تو اتنا بڑا فرض اِس پر عائد نہیں ہو جاتا، اور دُوسری بات اِس میں یہ ہے کہ اہل وعیال بھی اپنی جان ہی کی طرح ہیں، اُن کو جہنم کی آگ سے بچانے کی ذمّہ داری بھی جو گھر کے بڑے ہیں، جو والدین ہیں اُن پر عائد ہو جاتی ہے۔ اگر اس کو رُوحانی (sense) میں لیں اور مذہبی طور پر لیں تو یوں ہوگا کہ جہاں جماعت کے عملدار، کام کی ذمّہ داری کے لحاظ سے اور امام کے نمائندے ہونے کی حیثیت سے ہمارے والدین ہیں، تو اُن پر بھی اِس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ امام نے فرمایا کہ اگر کوئی اسماعیلی بچّہ بے راہ ہو جائے تو اُس کا نصف گناہ والدین پر اور نصف گناہ عملداروں پر آتا ہے [''دین سے آشنا نہ ہونے کی وجہ سے جو لوگ دین سے نکل جائیں گے اُن کا آدھا گناہ والدین پر ہوگا اور آدھا گناہ مکھی، کامڑیا اور جماعت کے دوسرے عملداروں پر ہوگا، کیونکہ ان کے کوشش نہ کرنے کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے'' راجکوٹ، ۲۱/ ۱۰/ ۱۹۰۳] کیونکہ جسمانی لحاظ سے، جسمانی والدین ہی والدین ہیں اور رُوحانی لحاظ سے عملدار والدین ہیں کیونکہ وہ امام کے نمائندے ہیں، کہ امام نے اُن کو اپنی جگہ پر جماعت کے والدین کی حیثیت سے مقرر کر دیا ہے، لہٰذا کسی بھی اسماعیلی کے مذہب سے چلے جانے کا جو گناہ ہے اُس کو آدھا ہونا چاہیئے کہ آدھا گناہ جسمانی والدین کا، اور آدھا گناہ رُوحانی والدین کا جو امامؑ کے نمائندے ہیں، جو اُس شخص سے قریب تر ہیں اور اِس مقصد کے لئے اِن کا تقرر کیا گیا ہے۔ یہ بہت مختصر آیت ہے اور بہت اِس کے اندر (meanings) ہیں۔

''یَآ اَیُّھَا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَا تَعۡتَذِرُوا الۡیَوۡمَ اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ'' کافروں آج بہانے مت بناؤ، جو عمل تم کیا کرتے ہو انہی کا تم کو بدلہ دیا جائے گا (۶۶۔ ۷)۔ ''یَآ اَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡا اِلَی اللّٰہِ تَوۡبَۃً نَّصُوۡحًا ''مومنو! خدا کے آگے صاف دل سے توبہ کرو'' عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یُّکَفِّرَ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَیُدۡخِلَکُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِھَا الۡاَنۡھٰرُ'' اُمید ہے کہ وہ تمہارے گناہ تم سے دُور کر دے گا اور تم کو باغہائے بہشت میں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں داخل کرے گا۔ ''یَوۡمَ لَا یُخۡزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ نُوۡرُھُمۡ یَسۡعٰی بَیۡنَ اَیۡدِیۡھِمۡ وَبِاَیۡمَانِھِمۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَآ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَاغۡفِرۡ لَنَا اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ'' ''اُس دن خدا پیغمبر کو اور اُن لوگوں کو جو اُن کے ساتھ ایمان لائے ہیں رسوا نہیں کرے گا بلکہ اُن کا نور اِن کے آگے اور داہنی طرف روشن کرتا ہوا چل رہا ہوگا، اور وہ خدا سے التجا کریں گے کہ اے پروردگار! ہمارا نور ہمارے لئے پورا کر اور ہمیں معاف فرما، بے شک خدا ہر چیز پر قادر ہے (۶۶۔ ۸)۔ یہ بہت ہی شاندار آیت ہے جس میں فرمایا جاتا ہے، کہ پیغمبر اور مومنین کے لئے یہی تکلیف ہمیشہ کے لئے نہیں رہے گی بلکہ ایک وقت آئے گا جس میں مومنین کا نور اُن کے آگے آگے چلتا ہوگا، اور اُن کی داہنی طرف چل رہا ہوگا، تو مومنین کہیں گے کہ خداوند ہمارے لئے

ہمارے نور کو مکمل کر دینا۔ اِس کے دو مقام ہیں، ایک تو انفرادی قیامت ورُوحانیت کا مقام ہے اور دوسرا اجتماعی قیامت یا کہ دورِ رُوحانیت کا مقام ہے، اُس میں ایسا ہوگا۔ آپ نے رُوحانیت کی باتیں سنتے ہوئے خیال کیا ہوگا، کہ نور جو خدا کے مقرب ہیں اُن کے لئے اُن کے سامنے، اُن کی پیشانی میں کام کرتا ہے اور جو اصحاب الیمین ہیں یعنی اولیاء کے بعد والے حقیقی مومنین، اُن کے لئے اُن کے دائیں کان میں نور کام کرتا ہے، اور ایک نکتہ اِس میں یہ ہے کہ نور یہاں مومنین سے منسوب ہے اور پیغمبر سے بھی منسوب ہے، اور ایک طرح سے دیکھا جائے تو "نُوۡرُھُمۡ" تو اُن سب کا، مجموعی طور پر اُن کا نور، مجموعی لحاظ سے بھی اُن کا نور کہا جا سکتا ہے اور ایک فردِ مومن کے لحاظ سے بھی اُس کا نور کہا جا سکتا ہے، یہ نور ایسا ہے کہ اِس کی نسبتیں، رشتے الگ الگ، خدا کا نور یہ بھی صحیح ہے، پیغمبر کا نور یہ بھی درست ہے، امام کا نور یہ بھی حقیقت ہے، مومن کا نور یہ بھی سچ ہے۔

اِس نور کے اتنے رشتے ہیں، چونکہ اِس میں وحدانیت ہے، (unity) کی صفت ہے، اپنانے کی خاصیت ہے، جیسے ابھی ابھی آگ اور لوہے کی مثال دی گئی تھی، آگ کی بھٹّی میں لوہے کے ایک ٹکڑے کو ڈالیے، تو اِس کو اپنائے گا، اِس کو اپنا ہم رنگ بنالے گا، اِس کو گرمائے گا، اِس کے اندر وہی خاصیت پیدا کرے گا، وہی صفت پیدا کرے گا جو آگ میں ہے، دوسرے ٹکڑے کو بھی ڈالیے، تیسرے کو بھی ڈالیے، سو ٹکڑوں کو لائیے اور اُن سب کو اِس آگ کے اندر بھٹّی میں ڈالیں، یہ آگ اُن کو پگھلا کے ایک بھی کر سکتی ہے اور اُن کو الگ الگ رکھتے ہوئے محض شعلے میں اور محض رنگ میں اُن کو (unify) کر سکتی ہے۔ اسی طرح نور کی خاصیت ہے، کہ نور کے اندر مونوریالزم کی صفت ہے، اگر ایک وقت میں سو مومنین، رُوحانیت کے ایک اعلیٰ مقام میں پہنچے ہوئے ہوں، تو وہ سو ایک ہوں گے اور اگر ہزار ہیں یا بے شمار ہیں، تو پھر بھی وہ ایک ہو جائیں گے، چونکہ نور کے اندر وحدت کی خاصیت ہے۔ اِس لئے پورے قرآن میں آپ کو نور کی مختلف مناسبتیں یا کہ رشتے یا اضافتیں ملیں گی، کبھی تو کہا گیا ہے، کہ خدا کا نور، کبھی فرمایا گیا ہے کہ رسولؐ کا نور، کبھی ارشاد ہوا ہے کہ امام کا نور، کبھی کہا گیا ہے کہ قرآن کا نور، کبھی فرمایا گیا ہے کہ اسلام کا نور اور کبھی کہا گیا ہے کہ مومن کا نور۔ دیکھیں کہ دنیا کے اندر ایک شخص ہے اُس کے کتنے رشتے ہیں، کسی کا باپ ہے، تو کسی کا بھائی ہے، کسی کا بیٹا ہے، تو کسی کا داماد ہے اور کسی کا سسر ہے، کسی کا شوہر ہے، کسی کا دوست ہے۔ اسی طرح جو رُوحانیت کا رشتہ ہے یا جو نسبت ہے وہ بہت رسا ہے یعنی پہنچنے والی چیز ہے۔ ایک لفظ یہاں جو تشریح طلب ہے "یَسۡعٰی" ہے، اور "یَسۡعٰی" دوڑنے کو اور جلدی کرنے کو کہا جاتا ہے "نُوۡرُھُمۡ یَسۡعٰی" یعنی اُن کا نور سرعت سے چلتا ہوگا۔ آپ کو یہ تشریح سُن کے بڑی مسرت وشادمانی ہوگی کہ جب رُوحانی ترقّی عروج پر ہوتی ہے، تو وہ سفر بڑی سرعت کے ساتھ طے ہو جاتا ہے، آپ نے سلسلۂ تقاریر میں یہ بات سنی ہوگی کہ سب سے نچلی سطح سے لے کر خدا کے مرتبے تک سفر کرنے کے لئے پچاس ہزار برس درکار ہے، لیکن یہاں جو "یَسۡعٰی" بڑی تیزی کے ساتھ رُوحانیت کے سفر کے طے ہونے کا جو اشارہ ہے اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ منازلِ رُوحانیت جو ہیں بڑی جلدی سے

طے ہو جاتی ہیں۔

اِس کے بعد ارشاد ہوتا ہے ''یَآ اَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ وَمَاْوَاھُمْ جَھَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ'' اے پیغمبر کافروں اور منافقوں سے لڑو اور اُن پر سختی کرو، اِن کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بہت بُری جگہ ہے۔(۶۶۔۹) تو ظاہری ترجمہ آپ نے سن لیا، اِس میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ زمانۂ نبوّت کے لحاظ سے اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسلمان کافروں کے ساتھ مقابلہ کرکے اُن کو شکست دیتے تھے، اب اِس زمانے کی نسبت سے اِس کی کیا تاویل ہوسکتی ہے۔ کیا یہ بات جس طرح ظاہر میں ہے دُرست ہوسکتی ہے کہ پیغمبر یا اُن کا کوئی جانشین دنیا بھر کے کافروں کو شکست دے، اور جس طرح کہ یہاں حکم ہے کہ کافروں اور منافقوں سے لڑو اور اُن پر سختی کرو اُن کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ ٹھکانے کے متعلق تو کوئی شک نہیں ہے لیکن اب جو صورتِ حال ہے اُس کے پیشِ نظر ہم اِس آیت کی حکمت کو کس طرح سمجھیں، تو یہ ہے کہ ایک ہے جنگِ تنزیل اور دوسری ہے جنگِ تاویل اور اِس جنگِ تاویل میں ہوتا یہ ہے کہ اِس کائنات کے اندر یعنی کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں خدا کے لشکر ہیں، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے کہ ''وَلِلّٰہِ جُنُوْدُ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا'' (۴۸:۷) اور خدا کے ہیں آسمان اور زمین کے لشکر، تو اِس لشکر سے کیا مراد ہے؟ لشکر کے اندر بہت ساری چیزیں آتی ہیں۔ ایسے اسباب، ایسے ذرائع، ایسی چیزیں، ایسی بلائیں، آفتیں اور پھر خود انسان دُنیا کے اندر، خدا جب چاہتا ہے، تو کسی بھی ذریعے سے کام لے کر کسی قوم کو برباد و تباہ کرسکتا ہے لہٰذا ہر ذریعہ خدا کے لشکر میں آتا ہے، اور خود انسان بھی، کافر و مسلمان سب ایک پہلو سے لاشعوری طور پر خدا کے لشکر ہیں، اور خدا کا جو منشاء ہے وہ پورا ہو کر رہتا ہے، تو اِس تاویلی جنگ کے لئے یہ اسباب ہیں، اور یہ لشکر ہیں، خداوند دُنیا کے اندر قوموں کو آپس میں لڑاتا ہے اور ایک پر ایک کو غالب لاتا ہے، اور پھر دوسری نوبت میں اُس پر بھی کوئی قوم غالب لاتا ہے، تو یہ تاویلی جنگ ہے اور خدا کے پنجے سے کوئی شخص نکل نہیں سکتا ہے۔

اِس کے بعد ارشاد ہوتا ہے، ''ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ'' خدا نے کافروں کے لئے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان فرمائی ہے، ''کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتَاھُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْھُمَا مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا وَّقِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّاخِلِیْنَ'' عجیب بات ہے، ''دونوں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں اور دونوں نے اُن کی خیانت کی، تو وہ خدا کے مقابلے میں اُن عورتوں کے کچھ بھی کام نہ آئے اور ان کو حکم دیا گیا کہ اور داخل ہونے والوں کے ساتھ تم بھی دوزخ میں داخل ہو جاؤ'' (۶۶۔۱۰)۔ عجیب بات ہے، بڑا سوال پیدا ہوتا ہے، کہ نوح پیغمبر کی بیوی اور لوط پیغمبر کی بیوی نے خیانت کی، دین کے معاملے میں یا دُنیا کے معاملے میں۔ اب ہوسکتا ہے، کہ نوح پیغمبر اور لوط پیغمبر دونوں کی دو بیویوں سے ایسے دو شخص

مراد ہوں جو اُن کی دعوت میں، اُن کے حجتوں میں سے ہوں، جنہوں نے انکار کیا کیونکہ بیوی کا مطلب صرف جسمانی نہیں ہے، اِس میں دینی اور علمی بات بھی آتی ہے، بہرحال تو دونوں باتوں میں سے دونوں ہوسکتی ہیں اور ایک بات ہوسکتی ہے۔ ''وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ '' ''اور مومنوں کے لئے ایک مثال تو فرعون کی بیوی کی بیان فرمائی ''اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ''فرعون کی بیوی نے التجا کی خدا سے کہ اے میرے پروردگار میرے لئے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اِس کے اعمالِ (زشت مآل) سے نجات بخش اور ظالم لوگوں کے ہاتھ سے مجھ کو مخلصی عطا فرما(۶۶:۱۱)۔ اِس میں بھی غور طلب بات یہ ہے کہ فرعون کافر تھا اور اُس کی بیوی مومنہ تھی، اور دوسری بات یہ ہے، کہ اُس نے یہ دُعا کیوں کی جو کہا کہ خداوندا! بہشت میں مجھے ایک گھر بنا اور وہ گھر تیرے پاس ہو، یعنی تیرے بنگلے، تیرے محل کے پاس ہو، اِس نے یہ خواہش کیوں کی؟ اُس کو کیا معلوم کہ خدا کا بھی کوئی گھر ہوتا ہے بہشت کے اندر، آپ جانتے ہیں کہ پورے قرآن میں خدا کی تاویل امام ہے، یعنی جہاں کہیں بھی خدا کا ذکر آتا ہے وہ امام ہی کا ذکر ہے اور فرعون کی بیوی کا یہ کہنا کہ اے پروردگار! بہشت میں میرے لئے ایک گھر بنا اور یہ گھر تیرے محل کے پاس ہو۔

امام کے محل کے قریب رہنا چاہتی ہے، یہاں پر ایک اور پوائنٹ ہے، آپ کا کیا خیال ہے قرآن کے اندر خدا کی باتیں ہیں، فرشتوں کی باتیں ہیں، پیغمبروں کی باتیں ہیں، مومنوں کی باتیں ہیں، کافروں کی باتیں ہیں، منافقوں کی باتیں ہیں اور قصے ہیں، حکایتیں ہیں۔ اِس کا (arrangment) کس طرح سے ہوگا؟ کیا ایسا ہے کہ جیسا کسی شخص نے کچھ کہا اُس کو انہی الفاظ کے ساتھ اور اسی (construction) میں، جیسے کسی قصے میں ہے یا کسی شخص کی گفتگو میں ہے، قرآن میں اُس (portion) کو اُس قصے کو حصہ دیا گیا ہے یا یہ کہ صرف مفہوم کو قائم رکھتے ہوئے خدا نے اُس قصے کو اپنے کلام کے طور پر پیش کیا، اِن دونوں باتوں میں سے کونسی بات ہوسکتی ہے اور اِس میں کیا ممکن ہے۔ اگر کسی ترتیب کے بغیر اور الفاظ میں حکمت رکھے بغیر لوگوں کی باتوں کو قرآن میں جگہ دی گئی ہے، تو پھر قرآن کا بیشتر حصہ حکمت سے خالی ہوگا، یہ بات جاننے کی ہے اور اگر مان لیا جائے، چونکہ یہ خدا کا کلام ہے، اِس لئے خدا نے اپنی حکمت کی زبان میں مفہوم کو ادا کرتے ہوئے اِس کو بنایا ہے، تو پھر یقیناً ہر جگہ پر اور ہر قصے میں، ہر واقعے میں حکمت ہی حکمت ہے، تو ہم اسی کو مانیں گے، میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ فرعون کی بیوی کو کیا معلوم کہ خدا کا کوئی گھر ہوتا ہے یا نہیں ہوتا ہے، کہ خدا تو ہر چیز سے پاک و برتر ہے، اور بھی دلائل ہیں کہ جن کی روشنی میں آپ کو یقین ہو جائے گا کہ قرآن جو ہے وہ خدا کا کلام ہے، خواہ اُس میں قصہ جس کسی کا بھی ہو لیکن قرآن کا جو بنانا ہے وہ خدا کا ہے تاکہ اُس کے اندر حکمت مکمل طور سے آجائے۔ اِس کے بعد مریم کی بات آتی ہے ''وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ

رَبِّهَا وَكُـتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ ''،اور دوسری مثال عمران کی بیٹی مریم کی ہے جنہوں نے اپنی عصمت کو،اپنی حیا کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی رُوح پھونک دی اور وہ اپنے پروردگار کے کلام اور اُس کی کتابوں کو برحق سمجھتی تھی اور فرمانبرداروں میں سے تھی (۶۶:۱۲) ۔مریم کی یہ تعریف کہ وہ باعصمت اور پاک دامن تھی ،جس کے نتیجے میں خدا نے اُس کے اندر اپنی رُوح کو پھونک دیا،سوال یہ ہوتا ہے کیا صرف یہی کافی ہے کہ کوئی خاتون پاک دامن رہے تو اُس کو رُوح القدس ملنی چاہئے یا اس میں کیا بات ہے ۔اصل بات اِس میں کچھ اور ہے وہ یہ کہ باعصمت رہنا دوطرح سے ہے،ایک ظاہر میں اور ایک باطن میں،ظاہر میں جو کچھ ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ہے،میں باطن کی بات کر رہا ہوں اور باطن یہ ہے کہ ہر شاگرد اور ہر حدِ زیریعنی نچلا حد جو ہے عورت کی جگہ پر ہے اور اُس کا باعصمت رہنا یہ ہے،کہ وہ غیروں کی باتوں کو نہ سنے،غیر مذہب والوں کی باتوں سے پرہیز کرے اور قطعاً پرہیز کرے،کسی بھی غیر کی بات کو نہ سنا کرے،اور اگر کوئی مومن اس شرط کو پوری کرتا رہا ہے اور وہ دوسروں کی باتوں کو قطعاً نہیں سنتا ہے،تو وہ اِس بات کی اہلیت رکھتا ہے کہ اُس میں رُوح القدس آئے گی،مگر رُوح القدس کس طرح آئے گی،وہ علم کی باتوں کی صورت میں آئے گی۔

خدا کا کسی میں رُوح القدس پھونک دینا یا اپنی رُوح پھونک دینا یہ ایک دن کی بات نہیں ہے ۔کوئی مومن علمُ الیقین کی باتوں کو سنتا رہتا ہے اور ہر وقت سنتا رہتا ہے اور دوسروں کی باتوں سے پرہیز کرتا ہے تو وہ مریم کی مثال ہے ۔علمُ الیقین کی اُن باتوں کے ساتھ خداوندِ عالم اس کی ذات میں اپنی رُوح کو پھونک دیتا ہے،جب اُس کا کورس مکمل ہو جائے گا تو ایک دن اُس میں رُوح القدس کام کرنے لگے گی ۔ابھی آپ نے دیکھا کہ آدم کے معاملے میں آپ نے سنا تھا کہ خدا نے آدم میں اپنی رُوح پھونک دی تھی،اب ہم دیکھتے ہیں کہ کتنی پشتوں کے بعد وہی عنایت،وہی مہربانی مریم پر ہوتی ہے اور مریم میں خدائی رُوح پھونکی جاتی ہے ۔اب یہ جو چیز آدم کے متعلق ہم خاص اور شاذ و نادر سمجھتے تھے،یہ چیز عام ہوگئی،دیکھیں قانونِ قدرت کو،بجائے اِس کے کہ خدا فرمائے کہ میں ہر پیغمبر میں اور ہر ولی میں اور ہر اعلیٰ مومن میں اپنی رُوح کو پھونکتا ہوں،تو اُس نے مثال کے طور پر مریم کے قصے کو پیش کیا اور فرمایا کہ اُس نے مریم میں اپنی رُوح پھونک دی تھی،تاکہ ہر مومن اِس حکمت کو سمجھ پائے اور یقین رکھے کہ ہر پیغمبر،ہر امام اور ہر حقیقی مومن میں یہ رُوح پھونکی جاسکتی ہے یعنی ہر پیغمبر اور ہر امام کے بعد یہ ممکن ہے کہ ہر مومن کو بھی یہ سعادت حاصل ہو،اور دوسری طرف عورتوں کی رُوحانی ترقّی کی مثال ۔اِس سے بڑھ کر کوئی ترقّی نہیں کہ خدا کی رُوح کسی عورت میں آجائے،کیونکہ قرآن میں ہے کہ فرشتے مریم سے باتیں کرتے تھے،تو یہ وحی کی بات ہوگئی،بہرحال اِس میں بہت کچھ سوچنے کی ضرورت ہے۔

اِس کے علاوہ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہر متعلم یعنی ہر رُوحانیت کا شاگرد مریم ہے،اِس میں پیروں کا قصہ اور اعلیٰ درجے کے مومنوں اور بزرگوں کا قصہ بھی آسکتا ہے،کیونکہ وہ بھی مریم ہیں،وہ بھی عورت ہیں ۔اپنے سے اُوپر جو

رُوحانیت کا درجہ ہوتا ہے اُس کے مقابلے میں، تو اِس بہانے سے خداوندِ عالم یہ اشارہ فرماتا ہے کہ کس طرح بزرگوں میں، پیروں میں، حجتوں میں اور اعلیٰ درجے کے مومنین میں خدا اپنی رُوح کو پھونک دیتا ہے، تو یہ سورہ یہاں پر ختم ہو جاتا ہے اور اِس کو آپ نے پڑھنا ہے، کیونکہ شروع میں میں نے جو کچھ آنحضرتؐ کی کچھ بیویوں کے بارے میں جو کچھ آپ کو بتایا وہ بہت ہی مختصر ہے، تو لہٰذا فرمان علی صاحب کے حاشیے کو پڑھنا، اُس کے اوپر کیا معاملہ ہوا تھا اور کیوں آنحضرتؐ نے قسم کھائی تھی اور وہ کونسی بیوی تھی جس نے آنحضرتؐ سے فرمایا کہ آپ کے منہ سے یعنی بو آتی ہے شہد کی، تو یہ بات آنحضرتؐ کو ناگوار گزری اور انہوں نے شہد کھایا تھا، تو اِس میں بیویوں کی کوئی سازش تھی وغیرہ اور اِس کے جاننے سے آپ کو پتا چلے گا کہ رسول اللہ بھی اپنے وقت میں کیسے کیسے مسائل سے دو چار ہوتے تھے، وغیرہ، اور اِس میں بہت سی معلومات فراہم ہوں گی اور اِس کا قصہ فرمان علی کے حاشیے پر درج ہے اور اِس پورے سورے کو آپ پڑھنا، اِس میں کافی باتیں ہیں اور ایک دو باتیں ایسی بھی ہیں جو میں نے آپ کے لئے چھوڑی ہیں، شکریہ میں آج کی اِس کلاس کو یہاں روک لیتا ہوں، اِس سلسلے میں جو سوالات ہوں گے وہ آپ کر سکتے ہیں۔

میں نے کہا تھا ایک تنزیلی جنگ ہے اور ایک تاویلی جنگ ہے اور تنزیلی جنگ پیغمبر سے متعلق ہے اور تاویلی جنگ جو ہے وہ امام کا حصہ ہے، کیونکہ ایک دن آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''اِنَّ مِنْکُمْ مَنْ یُقَاتِلُ علیٰ تَأْوِیلِ الْقُرْاٰنِ کَمَا قَاتَلْتُ علیٰ تَنْزِیْلِهٖ'' (شرح الاخبار، الجزاء الرّابع، ص: ۳۳۷) یقیناً تمہارے درمیان وہ شخص بھی ہے جو قرآن کی تاویل پر جنگ کرے گا، جس طرح کہ میں نے اس کی تنزیل پر جنگ کی تھی، تو لوگوں نے پوچھا کہ یا حضرت وہ کون شخص ہے؟ حضور نے مولا علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''خَاصِفُ النَّعْلِ'' اِس وقت جو جوتے کو درست کر رہا ہے وہی شخص ہے، تو [حضرت علیؑ] آنحضرت کے جوتے کو درست فرما رہے تھے۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ جو تنزیلی جنگ تھی وہ تو مادّی اور ظاہری جنگ تھی اور جو تاویلی جنگ ہے وہ اُس تنزیلی جنگ سے مختلف ہے، دُنیا کے اندر مختلف قدرتی واقعات کی شکل میں یہ جنگ امام کی طرف سے ہوتی رہتی ہے، تو اِس لئے دُنیا میں وہ جنگ، تاویلی جنگ جاری ہے، اور تا کہ انجامِ کار دینِ خدا کو ادیانِ عالم پر غالب لایا جائے۔ چونکہ اب دینِ خدا اِس وقت ادیانِ عالم پر غالب نہیں ہوا ہے لیکن خدائی پروگرام کے مطابق اِس دینِ اسلام کو، دینِ خدا کو دنیا بھر کے ادیان پر غالب ہو جانا ہے اور اِس کے لئے کام ہو رہا ہے، یعنی کہنا یوں ہے کہ اِن دنیا کی جنگوں، حادثوں اور واقعات کا کوئی رُوحانی پس منظر ہے اور اُس پس منظر میں امام کا ہاتھ ہے، چونکہ یہ رُوحانی جنگ اسی سے متعلق ہے، تاویلی جنگ اسی سے متعلق ہے، تو کرتے کرتے دُنیا کے اندر ایک انسانیت ابھرے گی اور ایک بین الاقوامی اتحاد پیدا ہوگا، اور پھر اسی میں اسلام کا آخری ظہور ہوگا اور خدا کا جو دین ہے دُنیا کے ادیان پر غالب آجائے گا، تو یہ تاویلی جنگ ہے۔

سوال: لفظ جنگ سے مطلب کیا مراد ہے؟

جواب: جی ہاں! کے اِن واقعات کو اور آہستہ آہستہ دُنیا جس طرف کو جا رہی ہے اور بتدریج دنیا سے صفحۂ کائنات سے ظلم جو مٹتا جاتا ہے اِس میں خدا کا ہاتھ ہے اور یہی جنگ ہے، جس طرح ہم مانتے ہیں کہ اقوامِ عالم کے درمیان گرم جنگ بھی ہے اور سرد جنگ بھی ہے۔ جنگ کے معنی کسی کو فتح دینا، کسی کو برتری دینا اور کسی کو شکست دینا، آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا سے کئی سیاستیں اور کئی قومیتیں مٹتی جارہی ہیں اور بتدریج عدل و انصاف اور انسانیت کا پلڑا بھاری ہوتا جارہا ہے، تو یہ جنگ ہے۔ کچھ برس پہلے یہ اقوامِ متحدہ کا تصوّر نہیں تھا اور دُنیا میں من مانی تھی، ظالم لوگ جو چاہیں وہ کرتے تھے، انسانیت کے ساتھ کھیلا جاتا تھا، غلام تھے، کنیزیں تھیں، لوٹ مار کا دور دورہ تھا۔ کوئی بادشاہ جتنے علاقے کو لے سکتا تھا، ابھی آہستہ آہستہ دُنیا بدل گئی ہے، کہیں کوئی ظلم کرتا ہے اور ملک گیری کرتا ہے تو پوری انسانیت سے آواز اُٹھتی ہے۔ اب اِس وقت بھی کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ساری دنیا کو لینا چاہتے ہیں لیکن نہیں لے سکتے ہیں، دُنیا کی (position) ایسی ہوگئی ہے کہ غریبی خود ایک طاقت بن کر ابھری ہے، جسے (third world) کہتے ہیں، اور (super power) جو چاہیں ایک حد تک پھر بھی کر سکتے ہیں لیکن جیسا وہ کرنا چاہتے ہیں نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ دنیا کے اندر ایک توازن پیدا ہو رہا ہے اور جو لوگ جس علاقے کو لینا چاہتے ہیں البتہ پہلے کی طرح نہیں لے سکتے ہیں۔ حالانکہ اسباب، اسلحہ کی فروانی ہے، یہ کیوں؟ اِس لئے کہ خدا کا جو پروگرام تھا وہ انجام کو پہنچ رہا ہے اور یہ وقت جو ہے بڑا عجیب ہے، کیونکہ یہ دَورِ قیامت ہے اور اِس میں دُنیا کے اندر دوستی بڑھے گی، اتحاد ہوگا اور نہیں کہا جاسکتا ہے، کہ اِس کے لئے پھر بھی کتنے برس لگیں گے لیکن خدا کا جو منشاء ہے وہ ہو کر رہے گا اور دُنیا کے اندر امن و امان قائم ہوجائے گا اور وہ ادارے کامیاب ہوجائیں گے جو (international level) پر کام کر رہے ہیں، وہ انسانیت کے لئے مفید ہے اور خدا کے منشاء کے مطابق ہے، تو لوگ ناکام ہوجائیں گے جو انفرادی طور پر آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ پھر اِس کے پس منظر میں ایک خدائی طاقت کام کر رہی ہے وہ تاویلی جنگ ہے۔

سوال: غالب آنا جو ہے، ادیانِ عالم پر دین خدا کا غالب آجانا اِس کا مطلب یہ ظاہری اسلام ہے یا ہمارا اسماعیلی مذہب ہے امام کا ظہور کا نظریہ ہے؟

جواب: انہوں نے سوال کیا کہ ادیانِ عالم پر دین خدا کے غالب آنے کی جو صورت ہے اِس کو ہم کس طرح سے پہچانیں گے، اچھا سوال ہے اور میرے لئے یہ نیا سوال نہیں ہے، کئی دفعہ اِس پہ بحث ہو چکی ہے یہ کہ وہ جو صورتِ حال ہو گی، وہ (internationalism) کی صورت میں ہوگی اور اُس میں ملّایت کا کوئی تصور نہیں ہوگا، وہ اصل میں اسماعیلی شکل ہوگی لیکن اُس میں کافی ترمیمات ہوسکتی ہیں، ترمیمات ہوسکتی ہیں، وہ بہت ہی (social) قسم کی چیز ہوگی اور اُس میں انسانیت کا لحاظ رکھا جائے گا یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ اسماعیلی مذہب کی ایک ترقّی یافتہ صورت ہوگی، یہ اچھا

(word) ہے اور اُس میں ہمارے ملّاؤں کے کہنے کے مطابق ایکدم سے امام کا ظہور نہیں ہوگا۔ وہ امام کی بادشاہی ہوگی ، پھر بھی امام کی جو طاقت ہے صرف رُوحانیت میں کام کرے گی، وہ سب کچھ امام ہی کریں گے لیکن پھر بھی لوگ اُس کو، امام کو نہیں پہچانیں گے اور پہچاننے والے پہچانیں گے یہ سب کچھ امام سے [ہے]۔ یہ قرآن کی پیش گوئی ہے اور یہ جو ہم کہتے ہیں کہ اُس وقت امام نمایاں ہوں گے، یہ صرف رُوحانیت میں ہوں گے یا یہ کہ اِس کے لئے پھر اور بہت دور کا وقت چاہیئے، اب جو قریب میں ہونے والا ہے اُس میں امام خود کو نمایاں نہیں کریں گے، امام ہی سب کچھ کریں گے لیکن خود کو ظاہر نہیں کریں گے، پروگرام ایسا نہیں ہے، کیوں نہیں کریں گے؟ اِس لئے نہیں کریں گے کہ اگر امام ظاہر ہو گئے تو اِس وقت نہ ثواب ہوگا، نہ عقاب ہو گا بلکہ سب ہی یکساں ہو گئے بلکہ سب ہی امام کے دامن کو پکڑیں گے، جو ہزاروں برس سے انکار کیا گیا ہے وہ بھی اس بات کے مستحق ہو جائیں گے کہ اُن کو معاف کیا جائے اور اُن کو نوازا جائے، تو پھر کوئی فضل نہیں ہوگا، کوئی فضیلت نہیں ہوگی، معرفت نہیں ہوگا۔ لہٰذا تو جواب اِس دنیا میں اندھے ہیں وہ اُس وقت بھی اندھے ہوں گے اور جن کو اِس وقت آنکھ ملی ہے اُس وقت بھی اُن کی آنکھ کام کرے گی اور بہت کام کرے گی۔ لہٰذا اِس معرفت کے لحاظ سے یعنی دو قسموں میں ہوں گے لیکن پھر بھی دنیا میں امن و آسائش اور راحت، تو مطلب یہ کہ کچھ لوگ اُس کو سائنس کا نتیجہ ماننے لگیں گے، کچھ لوگ کہیں گے کہ یہ انسانیت کی کوشش ہے کہ دنیا کے اندر صلح وصلاح ہوئی اور اتنے اداروں نے کام کیا تو سب لوگ ایک ہو گئے ہیں لیکن اُس وقت ملّائیت کا، ملاؤں کا یعنی ایسا تصور نہیں ہوگا تو یہی بہت بڑی مشکل چیز ہے کہ جیسا لوگ سمجھ رہے ہیں ایسا نہیں ہوگا، کچھ اور طرح سے یہ ہے۔ اِس میں اسماعیلی مذہب کا جو کردار ہے، جو امام کا مرتبہ ہے وہ اپنی جگہ پر ٹھیک ہے صرف یہ کہ ظہور جو ہے وہ منظور نہیں ہے۔ وہ عالمِ رُوحانیت میں ظہور ہوگا، اِس مادّی عالم میں امن و امان اور صلح وصلاح ہوگی، سب لوگ آپس میں مل جائیں گے اور اُس کا بہانہ یہ ہوگا کہ بس یعنی سائنس نے اتنی ترقی کی اور دنیا کے اندر (international) جو ادارے ہیں انہوں نے کام کیا اور دُنیا کے اندر جو (super powers) ہیں انہوں نے آپس میں دوستی کی اور سب لوگ اور ساری حکومتیں ایک ہو گئیں، ایک ہی آئین ہوگا، ایک ہی قانون ہوگا اور دُنیا کے مختلف ممالک سے جو افراد ہیں وہ مل کر ایک نظام بنائیں گے، ایک قانون بنائیں گے، وہی ساری دُنیا میں چلے گا اور ممالک میں اپنی اپنی جگہ پر سب لوگ رہیں گے، جنگ کا وُجود نہیں رہے گا، ختم ہو جائے گا اور (boundries) وغیرہ بھی اِس سے آزاد ہوں گے اور دنیا کے اندر سائنسی ترقی کا دور دورہ ہوگا، بیماری تقریباً ختم ہوگا، اُس پر تقریباً کنٹرول ہوگا وغیرہ، تو یہ فنی، سائنسی اور سیاسی شکل میں انقلاب آئے گا، اسی کے اندر یعنی دینِ خدا کی رُوح ہوگی اور وہ دینِ خدا، مطلب یہ کہ دینِ خدا نئے سرے سے زمانۂ رسول سے دینِ خدا نہیں ہوگا، وہ قیامت کے دور میں جو دینِ خدا ہونا چاہیئے ایسا ہی ہوگا اور دینِ خدا یعنی اسماعیلی مذہب ہے۔

آج جو مولانا علیؑ کے زمانے سے اب تک بہت کچھ اِس میں تبدیلی آ گئی ہے اور ہم جس زمانے کا ذکر کر رہے ہیں اُس تک اِس میں اور زیادہ تبدیلی آئے گی، تو تب اِس میں اسماعیلی مذہب اور دنیا جو ہے اُس میں ہم آہنگی اور یک رنگی ہو گی تو ہمارے لئے وہ مذہب اور دوسروں کے لئے وہ دُنیا کی ترقّی ہے، اور یہ یہی خلیل ہو گا، چونکہ ابھی میں نے ایک کلیہ آپ کو بتایا نا کہ جواب اِس وقت اندھا ہے وہ اُس آخر وقت میں بھی اندھا رہے گا۔ یہ کلیہ ایک ایسا قانون ہے پھر اُس میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

ایک تو پتھر یعنی سختی کے معنی میں یعنی کہ آتشِ دوزخ کی سختی کو ظاہر کرنے کے لئے بتایا گیا ہے اور اِس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کے اندر بھی دو قسمیں ہیں، کچھ لوگ پتھر ہیں اور کچھ لوگ لوگ ہی ہیں، تو وہ جو پتھر ہیں اور جو لوگ ہیں، دونوں پر اثر انداز ہونے والی آگ ہے۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: نجمہ بیگ نظرِ ثانی: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی (ق) کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ لقمان کی حکمتیں

کیسٹ نمبر: Q-25 تاریخ: ۱۰ر مئی ر ۱۹۸۴ کراچی

Click here for Audio

عزیزان یا علی مدد!

آج ہم سورۂ لقمان میں سے کچھ پڑھنا چاہتے ہیں اور اِس کے لئے بہتر یہ ہے، کہ حضرت لقمانؑ کے بارے میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے، اُسی کو لے لیں گے، جو نمبر ۲ رکوع سے شروع ہوجاتا ہے۔"بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○ وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا لُقۡمٰنَ الۡحِكۡمَةَ اَنِ اشۡكُرۡ لِلّٰهِ وَمَنۡ يَّشۡكُرۡ فَاِنَّمَا يَشۡكُرُ لِنَفۡسِهٖ وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيۡدٌ". اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے رہو اور جو شخص شکر کرے گا وہ اپنی ذاتی نفع کے لئے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ تعالیٰ بے نیاز خوبیوں والا ہے (۳۱:۱۲)۔

اِس آیۂ کریمہ سے حضرت لقمانؑ کا ذکر شروع ہوتا ہے اور اِس میں سب سے پہلی بات یہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے لقمانؑ کو حکمت عطا کر دی تھی اور حکمت عطا کر دینے کا مقصد شکر کروانا تھا۔ اب ہمیں سوچنا چاہئے کہ حکمت اور شکر کی کیا مناسبت ہوتی ہے، اِس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ لقمانؑ کی مرتبت اللہ کے نزدیک کیا تھی۔ ارشادِ باری تعالیٰ سے یہ اشارہ ملتا ہے، کہ لقمانؑ کامل انسانوں میں سے تھے کیونکہ خداوندِ عالم جس کو حکمت عطا فرماتا ہے وہ کوئی عام انسان نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ہم یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ لقمانؑ کامل انسانوں میں سے تھے اور اِس حکمت کے دینے کا یہ مطلب ہے کہ لقمانؑ علم لدنّی سے مستفیض ہوئے تھے۔ اب حکمت اور شکرگزاری کی مناسبت کی بات آتی ہے، چنانچہ ظاہر ہے کہ حکمت ایک ایسی عقلی روشنی کا نام ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی گوناگون نعمتوں کا پتا چلتا ہے، تب ہی تو شکر واجب ہوجاتا ہے اور شکر کرنے کا سوال پیدا ہوجاتا ہے۔ دوسرا مطلب اِس کا یہ ہے کہ حکمت کے بغیر نہ تو کسی نعمت کی شناخت ہو جاتی ہے اور نہ نعمتوں کی شکرگزاری کی اہلیت پیدا ہوجاتی ہے، اور اِس آیت کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ جو انسان شکر کرتا ہے تو وہ اپنی ذات ہی کے لئے کرتا ہے، گوکہ یہ شکر اللہ ہی کے لئے ہوتا ہے لیکن اِس کا فائدہ انسان کی اپنی ذات کے لئے ہوتا ہے۔

اِس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: "وَاِذۡ قَالَ لُقۡمٰنُ لِابۡنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَىَّ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ اِنَّ

الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ ''اور جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا! خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا بے شک شرک کرنا بڑا بھاری ظلم ہے (۳۱:۱۳)۔جس طرح اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اُس نے لقمانؑ کو حکمت دی تھی، تو اللہ کے اِس فرمان سے ایک طرف سے حکمت کی اہمیت ظاہر ہو جاتی ہے اور دوسری طرف سے یہاں لقمانؑ جو کچھ کہتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے، اُس کی اہمیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں اِس سلسلے میں سب سے پہلے شرک کا ذکر ملتا ہے، سو شرک کے متعلق جاننا بہت ہی ضروری معلوم ہوتا ہے، اِس لئے کہ خدا نے لقمانؑ کو جو حکمت دی تھی اور لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو جس طرح نصیحت کی تھی، اُس کو اللہ تعالیٰ زبانِ قدرت سے بیان فرماتا ہے۔ اِس معنیٰ میں شرک کی حقیقت جاننا بے حد ضروری ہوتا ہے، کہ لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو جو جو نصیحتیں دیں اُن میں سرِفہرست شرک کا ذکر تھا اور یہاں جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ یہ ظلم دو طرح سے ہے، ایک تو ظلم اُس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اپنی جگہ نہ رکھا جائے یعنی جو بنیادی نظریات ہیں اُن کو درہم برہم کر دیا جائے یہ ظلم ہے، دوسرا ظلم کسی کا اپنی رُوح پر ہے یعنی اپنی جان پر ظلم ہے اور یہ ظلم ایسا ہے کہ اِس کا کوئی مداوا نہیں، کوئی علاج نہیں یعنی اِس کی کوئی معافی نہیں، اِس لئے یہ بہت بڑا ظلم ہے۔

اُس کے بعد پھر ارشاد ہوتا ہے: ''وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰى وَهۡنٍ وَّفِصَالُهٗ فِىۡ عَامَيۡنِ اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ وَلِوَالِدَيۡكَ اِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ '' پھر خداوند بتقاضائے حکمت درمیان میں ارشاد فرماتا ہے اور ہم نے انسان کو اِس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے۔ اِس کی ماں نے ضعف پر ضعف اُٹھا کر اِس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اِس کا دودھ چھوٹتا ہے، کہ تو میرے اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کیا کر، میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے (۳۱:۱۴)۔ یہاں پر حقِ والدین کا ذکر آتا ہے جس کے متعلق خداوندِ عالم انسان کو تاکید فرماتا ہے، کہ وہ اپنے والدین کے حق کو مانیں، اُن کی شکر گزاری کریں اور ارشاد ہے کہ انسان کی ماں کا بھی بہت بڑا حق ہے، کہ اُس نے ضعف پر ضعف کو برداشت کرتے ہوئے بچے کو اُٹھایا اور دو سالوں میں بچے کے دودھ کو چھڑانا ہوتا ہے، تو انسان سے فرمایا گیا کہ وہ پہلے تو خدا کی شکر گزاری کرے اور پھر اپنے والدین کی شکر گزاری کرے اور خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے، یعنی اچھے اور بُرے اعمال کے نتائج کو دیکھنے کیلئے اور فرمانبرداری و نافرمانی کی جزا و سزا کو دیکھنے کے لئے خدا کے حضور جانا پڑتا ہے، تو یہاں جس طرح حقوقِ والدین کا ذکر فرمایا گیا ہے اُس میں دو قسم کے والدین آتے ہیں، ایک جسمانی اور دوسرے رُوحانی۔ کیونکہ جس طرح جسمانی والدین اپنے بچے کی پرورش میں محنت اُٹھاتے ہیں، تکلیف برداشت کرتے ہیں، اِسی طرح رُوحانی والدین بھی کسی رُوحانی فرزند کو، اپنے روحانی فرزند کو پالنے میں تکلیف اُٹھاتے ہیں۔

''وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَصَاحِبۡهُمَا فِى الدُّنۡيَا مَعۡرُوۡفًا وَّاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَىَّ ثُمَّ اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ

تَعْمَلُوْنَ "خداوندِ عالم انسان سے فرماتا ہے، کہ اگر تمہارے والدین اِس بات پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے، اِس حالت میں کہ تجھ کو اِس کا علم نہ ہو تو اُس صورت میں تم اُن کی فرمانبرداری نہیں کرنا لیکن پھر بھی اُن کے ساتھ دُنیا میں خوبی سے سلوک کرنا دنیا میں، اور دین کے معاملے میں اُس کا رستہ اختیار کرنا جو میری طرف رُجوع کرتا ہے پھر تم سب کا رُجوع میری طرف ہوگا، پس میں تم کو خبر دوں گا جو کچھ کہ تم دنیا میں کرتے تھے (۱۵:۳۱)۔ اِس میں ایک ظاہری معنی یہ ہیں کہ بعض دفعہ انسان کے ماں باپ کسی غلط دین پر ہوتے ہیں، کسی غلط نظریے کو اپناتے ہیں، تو اُس صورت میں یہ مناسب نہیں کہ انسان یہ کہہ کر اُس غلط رستے کی پیروی کرے کہ یہ میرے ماں باپ کا طریقہ ہے، جس طرح قرآن میں کفّار کی یہ عادت بیان کی گئی ہے، کہ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو اِسی رستے پر پایا اور ہم نے اُن کی تقلید کی، تو اِس آیت کے بموجب خداوندِ عالم اندھی تقلید کو نہیں چاہتا ہے، بلکہ انسان پر یہ فرض ہے کہ دین کے بارے میں وہ تحقیق کیا کرے اور اگر اُس کے ماں باپ کسی غلط دین پر قائم ہیں، تو اُس سے وہ باز آئیں اور والدین کی ہر بات کو مانیں مگر دین کے بارے میں اگر غلط بات بتاتے ہیں تو اُس کو رَد کریں، یہ اِس آیت کا ایک پہلو ہے۔

اُس کے بعد پھر لقمانؑ کی نصیحت کا سلسلہ چلتا ہے جو اُس نے اپنے بیٹے کو کی: "یَا بُنَیَّ اِنَّھَآ اِنْ تَکُ مِثْقَالَ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَکُنْ فِیْ صَخْرَۃٍ اَوْ فِی السَّمَاوَاتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِھَا اللّٰہُ اِنَّ اللّٰہَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ" بیٹا! اگر کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر ہو، وہ کسی پتھر کے اندر ہو یا وہ آسمان کے اندر ہو یا وہ زمین کے اندر ہو تب بھی اُس کو اللہ تعالیٰ حاضر کر دے گا (۱۶:۳۱)۔ ظاہری ترجمہ اِس کا یہ ہے، مگر اِس میں ایک رُوحانی اشارہ موجود ہے، وہ یہ کہ لقمانؑ اپنے چھوٹے بیٹے سے کہتا ہے، کہ اے میرے چھوٹے بیٹے! اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر ہو یعنی ذرّاتِ رُوح اور وہ ذرّہ رُوح آسمان میں ہو یا پہاڑ کے اندر ہو، تو اللہ تعالیٰ رُوحانی انقلاب کے دوران اُس کو حاضر کرے گا اِس کا مطلب یہ ہے، کہ جب قیامت برپا ہو جاتی ہے یا کہ جب رُوحانی انقلاب برپا ہو جاتا ہے، تو اُس وقت خداوندِ عالم تمام ذرّاتِ ارواح کو یعنی ہر چیز کی رُوح کو آسمان اور زمین کی تمام چیزوں کی ارواح کو یکجا کر دیتا ہے، اور یہاں جس طرح سے فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی چیز پتھر کے اندر ہے، چٹان کے اندر ہے، تو وہ بھی خدا کے حکم سے حاضر ہو جائے گی۔ مطلب یہ پہاڑ کی رُوح ہے، پتھر کی روح ہے اور آسمان کی تمام چیزوں کی ارواح ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ رُوحانی انقلاب کے دوران حاضر کرے گا۔ جیسے ہم مانتے ہیں کہ ہر چیز کی رُوح ہے یہاں تک کہ پتھر کی بھی رُوح ہے، اگر بے جان چیزوں کی ایک خوابیدہ رُوح نہ ہوتی، ایک منجمد رُوح نہ ہوتی، ایک خاموش رُوح نہ ہوتی تو خداوندِ عالم یہ ارشاد نہ فرماتا کہ وہ اِس کائنات کو نچوڑ کے اُس کی ایک رُوح بنانے والے ہیں، اُس کے خلاصے کو اپنے دستِ راست میں لینے والے ہیں۔

ہم نے کبھی شاید گفتگو کی تھی کہ جب کوئی شخص جواہر کی تلاش میں پہاڑوں کے سینے کو چیرتا ہے، تو اُس کو معلوم ہو جاتا

ہے کہ جواہر یعنی لعل، یاقوت وغیرہ کس طرح بنتے ہیں، پتا چلتا ہے کہ سب سے پہلے ایک پوائنٹ بن جاتا ہے وہ پوائنٹ بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے وہ ایک نقطہ ہوتا ہے ایک خاص قسم کے پتھر کے اندر وہ نقطہ یا وہ ذرّہ، رُوح ہے یا آپ اُس کو بیج کہہ سکتے ہیں، تو پہاڑوں کے سینوں میں خداوندِ عالم جواہر کے بیج کو بو دیتا ہے یعنی ایک خاموش رُوح یا کہ منجمد رُوح وہاں رکھتا ہے، وہ رُوح اِس طرح کام کرتی ہے جس طرح ماں کے پیٹ میں بچے کی رُوح کام کرتی ہے، پھر وہ رُوح پتھر کے ایک حصے کو اپنا ہم رنگ، ہم صفت بنا لیتی ہے، اِسی سے یاقوت، لعل، عقیق وغیرہ بن جاتا ہے، تو ہمیں باور کرنا ہوگا، کہ وہ رُوح ہے۔ اِس کے علاوہ اِس سلسلے میں ہمیں یہ بھی جاننا چاہئے، کہ بیج چیزوں کے دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک قسم کے بیج جو ہیں وہ مادّی اور خلقی ہیں، کہ اُن کے لئے کچھ وقت لگتا ہے، دوسرے بیج ابداعی ہیں، وہ کن فیکون کے تحت کام کرتے ہیں۔ غور و فکر کرنے سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے، کہ شروع شروع میں اور کبھی کبھار اب بھی پہاڑوں، جنگلوں میں اور آبادیوں میں بعض دفعہ کوئی چیز اُگتی ہے، کوئی نبات اُگتی ہے یا چھوٹے موٹے جانور پیدا ہو جاتے ہیں یعنی ایسی نباتات اور ایسے جانور کہ پہلے اُن کی نسل ہی نہیں تھی، یہ کیسے پیدا ہو گئے؟ کوئی گھاس، کوئی درخت جس کا جسمانی بیج نہیں تھا لیکن یکا یک وہ پیدا ہو گیا یا کوئی ایسا جانور جو ماں باپ کے بغیر پیدا ہو جاتا ہے، کسی سڑی ہوئی چیز کے اندر، کسی پھل میں۔

سائنسدان جراثیم کو مانتے ہیں، جراثیم تو ایک حیات ہے لیکن یہ جراثیم کیسے پیدا ہو گئے؟ جراثیم اچھے بھی ہیں بُرے بھی ہیں، ہم اِن کو ارواح کہتے ہیں یہ ارواح اچھی بھی ہیں بُری بھی ہیں، ذرّاتِ رُوح مانتے ہیں یہ تو حیات کی بات ہوئی۔ اب سوچیے نباتات کے بارے میں چھوٹے موٹے جانور تو جراثیم سے پیدا ہو گئے سائنسدانوں کے بقول، اور ہمارے نزدیک وہ ارواح سے پیدا ہو گئے۔ لیکن نباتات اور درخت جو پہلے نہیں تھے، وہ کس طرح پیدا ہو گئے؟ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ کوئی بھی سیّارہ اِس فضا میں پیدا ہو سکتا ہے اور سیّارۂ زمین کے برابر بھی کوئی دنیا پیدا ہو سکتی ہے، خواہ وہ سورج سے ہو یا ایتھر سے ہو۔ لیکن ایسے سیّارے میں یہ نباتات، یہ درخت، یہ انسان کہاں سے آئے؟ یعنی جب یہ زمین بنی، سیّارۂ زمین بنا تو ظاہر بات ہے کہ شروع شروع میں اِس پر کچھ نہیں تھا، خواہ بعض سائنسدانوں کے مطابق یہ آگ کے ایک لاوے سے بنا یا رفتہ رفتہ کئی کئی زمانوں کے بعد اِس فضا سے یا ایتھر سے اِس کو مادّہ ملا، جس طرح اب سائنسدان کہتے ہیں کہ ہر سال یہ زمین کچھ نہ کچھ مقدار میں بڑھتی چلی جاتی ہے، اِس کی وجہ شاید سورج کی تابانی ہے جو سورج کی کرنیں پڑتی رہتی ہیں، تو وہ مادّہ ہیں، اُس میں مادّیت ہے، سورج کی کرنیں کچھ رُوح تو نہیں ہیں، اُس میں مادّیت ہے، لطیف مادّیت اور سورج کائناتی بھٹّی ہے۔ نظامِ شمسی اِس لئے کہا جاتا ہے، کہ بہت سارے سیّارے اور ستارے سورج سے منسلک ہیں اور جو سیّارہ اِس سورج سے منسلک ہے یعنی جو سیّارہ سورج کی رسائی کے اندر ہے یا رسائی کے حدود میں ہے یا رسائی کے دائرے میں ہے، تو اُس کو سورج مادّہ دیتا جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنا سارا مادّہ سورج کی ذات میں کہاں سے آیا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ سورج ایک بھٹّی کی طرح ہے اور اِس میں ایتھر سے ایندھن پڑتا جاتا ہے اور اِس ایندھن کی سورج تحلیل کرتا ہے، اور انرجی کی صورت میں اور لائٹ کی صورت میں حرارت کی صورت میں اِس ایندھن کو وہ تبدیل کرتا ہے اور پھر وہی ایندھن ایک سلسلے کی صورت میں پڑتا رہتا ہے اور وہاں سے زمین پر اور دوسرے سیّاروں میں کچھ نہ کچھ ذرّات پڑتے رہتے ہیں، تو اِسی طرح ہر سال نہ صرف زمین کی مقدار بڑھتی چلی جاتی ہے، بلکہ ہر ستارے اور ہر سیّارے کی مقدار بڑھتی چلی جاتی ہے، یہ سورج کی وجہ سے ہے۔ اِسی طرح کسی سیّارے کے بننے کی دو صورتیں ہیں یا یہ کہ یک لخت سورج سے کچھ لاوا خارج ہو گیا، جس طرح بعض سائنسدانوں کا خیال ہے اور اُس لاوے سے زمین بنی یا یہ ہے کہ رفتہ رفتہ ایک ہی ذرّے سے بہت سارے ذرّات منسلک ہوتے رہے اور زمانہائے دراز کے بعد ایک زمین بنی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب زمین بنی، تو اُس وقت اِس پر نہ تو بناتات تھیں، نہ جانور تھے اور نہ انسان اور یہ آئے کہاں سے؟ آئے عالمِ امر سے کہ ہر چیز کی ہستی کے دو مقام ہیں، ایک عالمِ امر ہے اور ایک عالمِ خلق ہے اور اِن دونوں کے درمیان چیزیں منتقل ہوتی رہتی ہیں کہ عالمِ امر سے عالمِ خلق میں چیزیں آتی ہیں تو کثیف بن جاتی ہیں اور عالمِ خلق سے عالمِ امر چیزیں منتقل ہو جاتی ہیں تو لطیف بن جاتی ہیں اور یہ سلسلہ لاانتہا ہے۔

کہنے کا مقصد یوں ہے کہ بیج جو ہوتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں، کچھ بیج رُوحانی ہیں، کچھ بیج مادّی ہیں اور یہاں پر یہ بھی بتا کے آگے بڑھیں کہ حضرت نوح علیہ السّلام سے جو فرمایا گیا تھا کہ اے نوح! تم تمام چیزوں کے جوڑوں کو اپنے ساتھ کشتی میں لے لینا، تو تمام چیزوں کے جوڑے رُوحانی طور پر تھے، جسمانی طور پر ناممکن، اِس لئے کہ کوئی شک نہیں کہ نوح پیغمبر کی ایک کشتی تھی، جس کو بعد کے زمانے میں (discover) کیا گیا اور کوہِ جودی سے اُس کو نکال کے کسی میوزیم میں لایا گیا، تو اُس کشتی کا جو سائز تھا اتنا زیادہ نہیں تھا کہ دُنیا بھر کے تمام جانوروں کے جوڑے اُس میں آجائیں۔ آج کی دُنیا میں بہت سے حقائق روشن ہو کر سامنے آئے ہیں اِس سلسلے میں یہ بھی پتا چلا کہ دُنیا میں کتنی قسم کے جانور پائے جاتے ہیں، ہزاروں لاکھوں قسم کے جانور ہیں، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اُس کشتی میں جس کا ذکر، جس کے سائز کا ذکر بائبل میں موجود ہے اور وہ کشتی آج دنیا کے کسی میوزیم میں ہے، غالباً رشیا یا کسی اور حکومت کے میوزیم میں موجود ہے، اُس کو دیکھا جائے تو دُنیا بھر کے تمام جانوروں کے جوڑے اُس میں نہیں آسکتے ہیں۔ اِس سے ظاہر ہے کہ نوح علیہ السّلام نے اپنی رُوحانی کشتی میں تمام مخلوقات یعنی تمام چیزوں کے رُوحانی جوڑوں کو لیا تھا۔ مطلب اِس کا یہ تھا کہ اُس نے ایک ذاتی کائنات کو یا کہ ذاتی دنیا کو بسانا تھا، اُس نے عالمِ ذرّ کو آباد کرنا تھا۔ لہٰذا اُس نے ذرّات کی صورت میں تمام چیزوں کو اپنے ساتھ لے لیا۔ اِس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ جو ذرّات ہیں، جن کو میں نے یہاں بیج کے نام سے موسوم کیا، وہ رُوحانی ہیں اور نوحؑ جو اِس کائنات کو اُس طوفان سے بچا سکتا تھا، وہ رُوحانی طور پر بچا سکتا تھا، یہ رُوحانیت کی بات ہے اور اِس کے تحت یہ ذکر ملتا ہے کہ وہ ایک نئی دنیا کو

وجود میں لانا چاہتے تھے، جو خدا کے حکم سے ایک نئی دنیا کو بسایا۔ یعنی نوحؑ نے یہاں پر جس طرح لقمانؑ کی حکمت کی بہت بڑی اہمیت ہے اور اِسی کے تحت شرک کا ذکر ہوا اور اللہ کے حقوق کا ذکر ہوا، اور والدین کے حقوق کا ذکر ہوا اور اِسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ اگر کوئی ذرہ پہاڑ کے اندر ہے تو وہ بھی خدا کے حکم سے حاضر ہے، اگر کوئی چیز آسمان کی بلندیوں میں ہے تو وہ بھی رُوحانی انقلاب کے دوران حاضر ہو جائے گا اور اِس کی مثال کے طور پر میں نے عرض یہ کی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مثال میں یہ بتایا ہے کہ وہ کائنات کو سمیٹ کے اور کائنات کو نچوڑ کے ایک ایسی چھوٹی سی چیز بنانا چاہتا ہے کہ وہ خداوند کے قبضۂ قدرت میں یعنی اُس کی مٹھی میں آسکتی ہے اور اُس میں سب کچھ ہے، تو یہ دو مثالیں ہوئیں، ایک مثال میں اللہ ہر چیز کے ذرّے کو یا ہر چیز کی رُوح کو حاضر کرے گا اور دوسری مثال میں وہ اِس کائنات کو نچوڑ کے ایک موتی بنائے گا اور اُس میں آسمان وزمین کی ہر چیز موجود ہوگی، اُس میں آسمان وزمین کی ہر چیز کی قیمت، ہر چیز کی قدر موجود ہوگی، تو یہاں اِسی ضمن میں یہ ارشاد ہے کہ خداوندِ عالم جب حکم فرمائے گا جب چاہئے گا تو کائنات سے ارواح یعنی ذرّاتِ رُوح جمع ہو جائیں گے۔

"یَا بُنَیَّ اَقِمِ الصَّلَاۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ" اے میرے چھوٹے بیٹے! نماز پڑھا کر اور اچھے کاموں کی نصیحت کیا کر اور بُرے کاموں سے منع کیا کر اور تجھ پر جو مصیبت واقع ہو صبر کیا کر یہ ہمّت کے کاموں میں سے ہیں (۱۷:۳۱) تو یہاں عبادت و بندگی ہوئی اور امرِ معروف اور نہی عن المنکر کی بات ہوئی اور صبر کی اہمیت بتائی گئی کہ مصیبتوں کے دوران صبر کرنا ہے وہ عالی ہمّتی کا کام ہے الوالعزمی کا کام ہے۔ پھر ارشاد ہوا کہ: "وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ" (۱۸:۳۱) اور لوگوں سے اپنا رُخ مت پھیر۔ یعنی منہ موڑنا یا گردن کشی کرنا، بے رُخی کرنا اس کی ممانعت کی گئی ہے: "وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا" اور زمین پر اترا کر مت چل (۱۸:۳۱)۔ اِس چیز کی مذمت کی گئی ہے: "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ" (۱۸:۳۱) بے شک اللہ تعالیٰ کسی تکبّر کرنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے۔ اِس میں حکمت یہ ہے کہ جس طرح انسان ظاہر میں کوئی حرکت کرتا ہے تو اُس کا اثر باطن پر پڑتا ہے، اِس لئے مومن کو چاہئے کہ وہ اپنی حرکات وسکنات پر پابندی لگائے، وہ محتاط رہے، یہ کہ وہ جیسے بولتا ہے، جیسے چلتا ہے، جیسے وہ کوئی کام کرتا ہے تو اُس کا اثر رُوح پر دل پر پڑتا رہتا ہے۔ لہٰذا انسان کو ظاہر میں باادب اور متواضع رہنے کے لئے تاکید کی گئی اور زمین پر اترا کر چلنے سے منع کیا گیا اور یہ بھی فرمایا گیا کہ فخر وناز کرنے والے سے خدا دوستی نہیں رکھتا۔ اِس کا اشارہ یہ ہے کہ خدا عجز وانکساری کرنے والے سے دوستی رکھتا ہے، یہ قرآن کا اُصول ہے کہ دو متضاد باتوں میں سے جب ایک بات کا ذکر ہوتا ہے تو دوسری بات بھی اِس کے سامنے آتی ہے، مثلاً جب کہا جاتا ہے کہ اِس میں شک نہیں تو معنی اِس کے یہ ہوتے ہیں اِس میں یقین ہے۔ جب فرمایا جاتا ہے کہ خدا فخر کرنے والوں کو دوست

نہیں رکھتا،تو اِس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ فخر کے سامنے جو کیفیت ہے یا جو معنی ہے یا جو چیز ہے اُس کو خدا چاہتے ہیں، جب فخر کو نہیں چاہتے ہیں تو عجز و انکساری کو چاہتے ہیں اِس کا مطلب یہ ہوا، اِس کو کہتے ہیں کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی چیز کا ذکر کرنا، جس کو انگریزی میں کہا جاتا ہے (direct) اور (indirect)۔ یہاں (indirect)) عجز و انکساری کا ذکر ملتا ہے۔

''وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ'' اپنی رفتار میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز کو پست کر (۱۹:۳۱) دیکھئے یہاں ایک تو چلنے کا ذکر ہے اور ایک تو بولنے کا ذکر ہے، اور اِس کے دو دو پہلو ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انسان کے چلنے میں اعتدال ہونا چاہیے، عام طور سے انسان کو اعتدال سے چلنا چاہئے کہ محض اُس میں سُست رفتاری اور نہ اُس میں سبکی ہو۔ کیونکہ کوئی بھی انسان جب جلدی جلدی سے چلتا ہے، عام حالت کسی ضرورت کا یہاں ذکر ہے تو اُس کا بھی اثر ہوتا ہے اور جب بہت ہی آہستہ چلتا ہے تو اُس کا بھی اثر ہوتا ہے۔ میں اِس میں پہلے پہلو کا ذکر کرتا ہوں، ظاہری پہلو کا ذکر کرتا ہوں اور اِس طرح بولنے میں پست آواز سے بولنے کی تلقین کی گئی ہے یا پست آواز کو ترجیح دی گئی ہے۔ یعنی عام طور پر جب بات آہستہ بولنے سے کام بنتا ہے اور سنائی دیتی ہے تو نرمی سے بولنا چاہئے اور پست آواز میں بولنا چاہئے، یہ اخلاقِ حمیدہ میں سے ہیں یعنی پسندیدہ بات ہے۔ درمیان چال سے چلنا اور پست آواز میں بولنا، اب اِس کا باطنی پہلو کیا ہے باطنی پہلو اِس میں یہ ہے کہ عبادت اور خصوصی ذکر کی رفتار معتدل ہونی چاہئے۔ مگر اِس میں ایک استثنا بھی ہے کہ اگر وسوسے بہت زیادہ آتے رہتے ہیں تو اِس میں تیز ذکر کرنا چاہئے، اگر وسوسے نہیں آتے ہیں اور سکون حاصل ہوا ہے اور منزل سکون کی ہے، نجات کی ہے، تو اُس میں اعتدال سے ذکر کرنا چاہئے اور بولنے سے یہاں ذکر کی اور مناجات کی آواز مراد ہے، کہ اُس میں جس قدر بھی ہو سکے اپنی آواز کو بہت ہی پست اور بہت ہی دبی ہوئی آواز میں مناجات کرنا چاہئے اور ذکر کرنا چاہئے، جب کہ ایک فرد ذاتی طور پر عبادت کرتا ہو اور اگر وہ کسی کو (lead) کرتا ہے، تو اُس میں اُس کی آواز اتنی ہونی چاہئے کہ اُس کے پیرو، اُس کے پیچھے چلنے والے اُس کو سُن سکیں اور اگر وہ تنہا ہے تو اُس کی آواز اتنی پست ہونی چاہئے کہ بس وہ تلفظ برائے نام ہو اور دل کی انتہائی پست آواز میں یعنی ذکرِ قلبی ہو اور ذکرِ خفی ہو۔ ''إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ'' بےشک آوازوں میں سب سے بُری آواز گدھوں کی آواز ہے (۱۹:۳۱) تو خداوندِ عالم مومنین کو ادب سکھاتے ہیں اور اُن کو بے جا آواز سے اور چیخ و پکار سے منع فرماتے ہیں اور مثال کے طور پر گدھوں کی آواز کو پیش کرتے ہیں۔

اِس کے بعد: ''أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً وَّمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتَابٍ مُّنِيْرٍ'' (۲۰:۳۱) ارشاد ہے کہ: کیا تم لوگوں کو معلوم نہیں ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے

اِس میں ’’سَخَّرَ‘‘ کا مطلب اُنہوں نے اِس طرح سے کیا ہے کہ تمہارے کام میں لگا رکھا ہے لیکن اِس کے رُوحانی معنی یوں ہیں کہ خداوندِ عالم نے آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جو کچھ ہے اُس کو یعنی ہر چیز کو مومن کا تابع فرمان کر دیا ہے یعنی مومن کے لئے ایک ایسا مقام بھی ہے کہ اگر اُس مقام کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کائنات اُس کے اشارے سے، اُس کے حکم سے چلتی ہے۔ اِس کی تاویل یہ ہے کہ جو نور ہے جو امرِ کُن ہے وہ انسان کا یعنی مومن کا نور ہے، اِس نور کے حکم سے کائنات قائم ہے اور چلتی رہتی ہے اور وہ نور انسان کی انا ہے۔ اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز مومن کے امر و فرمان کی اطاعت کرتی رہتی ہے اور اِسی طرح خداوندِ عالم نے انسان پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں یعنی کسی بھی نعمت کی کوئی بھی کمی نہیں رکھی ہے۔ جبکہ خداوندِ عالم کہتا ہے کہ نعمتیں پوری کی گئی ہیں تو پھر اِس تکمیل سے باہر نہیں رہتی ہے اور خدا کی بات درجۂ انتہا کو پہنچتی ہے، کہ خدا کی بات کوئی ادھوری بات نہیں ہوتی ہے۔ جس طرح ایک انسان کہتا ہے کہ کام پورا ہو گیا یا یہ چیز پوری ہوئی تو یہ اُس کے معیار کے مطابق بات ہے کہ جب خدا فرماتا ہے کہ تمام نعمتیں تم پر پوری کی گئی ہیں، تو اُس میں تمام نعمتیں آجاتی ہیں اور کوئی نعمت اِس سے باہر نہیں رہ سکتی ہے، یہاں تک کہ خدا کی صفات بھی خدا کی خدائی بھی اُن نعمتوں میں آجاتی ہیں۔

اہلِ باطن نے اِس آیت کے بموجب تاویلِ قرآن کا ثبوت پیش کیا، جب خدا فرماتا ہے کہ اُس نے ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں تو نعمت عقلی ہے، رُوحانی ہے اور نعمت قرآن کی حکمت ہے، نعمت قرآن کا باطن ہے، نعمت خدا کے بھید ہیں، نعمت خدا کی معرفت ہے، نعمت خدا کا عشق ہے، نعمت خدا کا دیدار ہے، نعمت بہشت ہے، تو اِس لفظ نعمت سے کوئی چیز باہر نہیں رہ سکتی ہے، کوئی راحت، کوئی مسرت شادمانی، اور کوئی عقلی چیز، کوئی بھید، کوئی راز اِس آیت سے باہر نہیں رہ سکتا ہے، تو تقریباً تمام آیات اُصولات کی طرح کام کرتی ہیں کہ اگر کسی بھی کلیے میں ہم سوچیں تو اِس کے معنی اتنے وسیع نظر آتے ہیں کہ اِس میں دنیا اور آخرت سمو جاتی ہے۔ پھر ارشاد ہے کہ لوگوں میں سے جو جدل کرتا ہے، بحث کرتا ہے، مناظرہ کرتا ہے، جھگڑتا ہے خدا کی بابت علم کے بغیر، ہدایت کے بغیر، کتابِ منیر کے بغیر یعنی خدا کو اِن تمام لوگوں پر اعتراض ہے جو علم کے بغیر، ہدایت کے بغیر اور کتابِ منیر کے بغیر خدا کے باب میں مناظرہ کرتے ہیں۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ تین ذرائع ہیں جو معرفتِ خدا اور توحید کے لئے ضروری ہیں، ایک ہے علم اور دوسری چیز ہدایت ہے، تیسری چیز کتاب منیر ہے، وہ علی الترتیب ہے سب سے پہلے علم ہے، اُس کے بعد ہدایت ہے، اُس کے بعد کتابِ منیر، تو علم داعی کا درجہ ہے اور ہدایت حجّت کا درجہ ہے اور کتابِ منیر امام کا درجہ ہے، معرفت اور توحید کے یہی تین ذرائع ہیں۔

’’وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ‘‘ (۲۱:۳۱) ارشاد ہوتا ہے کہ جب اُن لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم پیروی

کرو اُس چیز کی جو اللہ نے نازل فرمائی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم پیروی کریں گے اِس چیز کی جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا۔ یعنی ہم اپنے آباء و اجداد کی روایت کی پیروی کریں گے، اِس کے جواب میں خدا فرماتا ہے کہ کیا اگر شیطان نے اُن لوگوں کو یعنی اُن کے آباء و اجداد کو اور اُن کو دوزخ کی طرف دعوت دی ہے تو پھر بھی یہ لوگ اُسی [کی] پیروی کریں گے، یہ خداوندِ عالم کا اُن کے لئے جواب ہے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ تقلید کی پیروی بہت بُری چیز ہے، کچھ آگے جس طرح کہا گیا تھا کہ انسان کو اپنے والدین کی عزت کرنی ہے، مگر ایک چیز میں اُسے ایک احتیاط رکھی جائے کہ اگر اُس کے والدین کسی غلط نظریے کی پیروی کرتے ہیں، تو اُس صورت میں وہ شخص اپنے والدین کو چھوڑ سکتا ہے، باقی معاملات میں وہ اپنے والدین کی عزت کر سکتا ہے۔ اِسی طرح یہاں بھی آباء و اجداد کی غلط روایت کی غلط تقلید سے روکا گیا ہے۔

اِس کے بعد ارشاد ہے: ''وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى '' جو شخص اپنی ذات کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہ نیک کام کرتا ہے تو اُس نے گویا ''عُرْوَةِ الْوُثْقٰى '' کو پکڑ رکھا ہے (۳۱:۲۲) ''وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ''(۳۱:۲۲) اور اخیر سب کام اللہ ہی کی طرف پہنچے گا یعنی ''وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ '' کا مطلب کیا ہے، ''وَجْهَهٗٓ '' چہرے کو بھی کہا جاتا ہے، ''وَجْهَهٗٓ '' ذات کو بھی کہتے ہیں، جس نے اپنے چہرے کو اور اپنی ذات کو خدا کے حوالے کر دیا ہو اور ساتھ ہی ساتھ وہ نیک کام بھی کرتا ہو تو اُس نے ایسے مضبوط کڑے کو پکڑا ہے کہ پھر اُس کا ہاتھ کبھی نہیں چھوٹے گا یعنی اُس کو کبھی لغزش نہیں ہو گی۔ اِس میں ایک تو نظریے کی بات ہے اور دوسرا عمل کی بات ہے یعنی جب دین صحیح ہے اور عمل بھی صحیح ہے تو ایسے شخص نے گویا مضبوط کڑے کو پکڑا ہے اور پھر اُس کا ہاتھ کبھی نہیں چھوٹے گا، اور یہاں نظریے کی بات اِس طرح سے ہے کہ جس طرح ہم اپنی ایک انا کو خدا کے سپرد کر دیتے ہیں کہتے ہیں، کہ ہماری ایک انا خدا میں ہے یہ ہمارا نظریہ ہے، یہ ہمارا مونوریالزم ہے اور اِسی کے ساتھ ساتھ ہمارے اعمال بھی اچھے ہوں، تو اِس صورت میں ہم نے ''عُرْوَةِ الْوُثْقٰى '' کو پکڑا۔ ذات کو یا چہرے کو خدا کے حوالے کر دینے کے معنی ہیں کہ ہماری انائے علوی خدا میں ہے اور وہ انا کبھی وہاں سے الگ نہیں ہوئی، یہ نظریہ ہے اور یہ ہماری توحید ہے۔ ''يُّسْلِمْ '' سپرد کر دینا، ''وَمَنْ يُّسْلِمْ '' اور جو سپرد کر دیتا ہے، جو سونپتا ہے، جو حوالہ کرتا ہے، ''وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ '' اپنی ذات کی یہ تفویض ہے، کہ ہم اپنی ہستی یا رُوح کے سرے کو نورِ خداوندی کے سپرد کر دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم سورج کی کرن کی طرح آئے ہیں، کہ کرن کا بالائی حصہ سرچشمۂ نور میں ہوتا ہے اور دوسرا زمین کی سطح کو چھوتا ہے۔ ''وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ '' (۳۱:۲۳) اور جو اُس کی ناشکری کرے گا تو اُس کی ناشکری سے آپ کو تکلیف نہیں ''اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ''(۳۱:۲۳) پھر دوسری انا سے بھی لوگ ہماری طرف رُجوع کریں گے، تو اِس وقت ہم اُن کو اعمال کی خبر دیں گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ دل کی

باتوں کو جانتا ہے۔تو یہاں نمبر (۲۳) تک ہم نے ترجمہ کیا اور تھوڑی سی تشریح بھی کی۔

سورۂ لقمان میں سے گو کہ پورے سورے کا نام لقمان ہے لیکن ہم نے خاص طور سے اُن آیات کو لیا جس میں لقمانؑ کا ذکر ملتا ہے کہ لقمانؑ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں اور یہ حصہ اِس لئے ضروری ہے کہ خداوندِ عالم نے گواہی دی کہ اُس نے لقمانؑ کو حکمت دی تھی اور یہ فرماتے ہوئے آگے خداوندِ عالم نے لقمانؑ کی کچھ باتیں بتائیں (۳۱:۱۲)۔اِس سے ہمیں یقین آتا ہے کہ خداوندِ عالم نے بڑی اہم باتوں کو لیا لقمانؑ کی باتوں میں سے۔کیونکہ اُس نے لقمانؑ کو حکمت دی تھی اور اِس میں ایک طرف سے حکمت کی اہمیت ظاہر ہوئی اور دوسری طرف سے حکمت کا مقصد معلوم ہوا کہ حکمت شکر گزاری کے لئے ہے اور نعمت شناسی کے لئے ہے، تو اِسی کے ساتھ یہ بھی پتا چلا کہ شکر گزاری کا مضمون بڑا اہم ہے اور شکر گزاری نعمت کی پہچان اور اُس کی قدر دانی کا نام ہے، اور اِس سلسلے کی ایک اور آیت ملتی ہے کہ: ''اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا ؕ وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ'' (۳۴:۱۳) اے داودؑ کی اولاد! تم شکر و عمل کرتے رہے، کیونکہ میرے شکر گزار بندے بہت ہی کم ہیں، تو خداوندِ عالم کا یہ فرمانا کہ شکر گزار بندے بہت ہی کم ہیں، تو اِس سے جو شکر گزاری ہے اُس کی اہمیت ظاہر ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ شکر گزاری آسان نہیں ہے، وہ مشکل ہے، اِس لئے شکر گزار بندے بہت کم ہیں اور اگر ہم شکر گزاری پر عمل کریں، تو خدا کی نظر میں پسندیدہ ہو سکتے ہیں۔اِس لئے کہ شکر گزاری کے لئے حکمت کی ضرورت ہے، اِس لئے کہ حکمت بہت بڑی چیز ہے، اِس لئے کہ شکر گزاری سے مسرت و شادمانی ملتی ہے، کوئی عبادت ایسی نہیں کہ اُس میں فوراً خوشی ہی خوشی ہو، ہر عبادت میں [خوشی ہے] لیکن بدیر۔لیکن شکر گزاری ایک ایسی عبادت ہے کہ اِس میں فوراً خوشی ہے کیونکہ ہم شکر گزاری اِس طرح سے کرتے ہیں، کہ ہم خدا کی ہر ہر نعمت کے لئے خوش ہو جاتے ہیں اور اِسی تصور سے حقیقی خوشی کا آغاز ہوتا ہے اور حقیقی خوشی ملتی رہتی ہے اور خداوندِ عالم ہمارے اِس تصور میں برکت پیدا کرتا ہے۔اِسی کے ساتھ یہ گفتگو ختم ہو جاتی ہے اگر اِس سلسلے میں کوئی سوال ہو تو ہم ان شاء اللہ کوشش کریں گے سوال کے جواب کو مہیا کر دینے کے لئے۔

سوال: (سر! یہ جو حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ خدا سے شرک مت کرنا یہ بہت بڑا ظلم ہے، اِس کے فوراً بعد والدین کے حقوق کا ذکر آنے میں کیا حکمت ہے)؟

جواب: والدین کے حقوق کا ذکر اِس لئے آیا ہے کہ حدودِ دین کی شناخت اور اُن کی شکر گزاری سے یہ شناخت ملتی ہے کہ توحید کیا ہے اور شرک کیا ہے؟ اِس میں ایک طرح سے حدود سے رُجوع کرنے کی تاکید کی گئی ہے، ہم جب رُوحانی والدین کی شکر گزاری کرتے رہیں گے، تو اُس میں ہمارے علم و معرفت میں اضافہ ہوتا رہے گا اور شرک جیسے بہت بڑے گناہ سے ہم اِس علم و معرفت کی روشنی میں، اِس علم و معرفت کے وسیلے سے بچ جائیں گے، تو اِس لئے اس میں حدودِ دین سے رُجوع کی تاکید کی گئی ہے۔

سوال نمبر ۲: (اگر یہاں والدین سے مراد حدودِ دین ہیں، رُوحانی والدین کا بھی جیسا کہ آپ نے فرمایا ذکر ہے تو اِس کے فوراً بعد کی آیت میں اگر تمہارے والدین اِس بات پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرا کہ اِس حال میں کہ اُس کا تجھ کو علم نہ ہو، تو اُن کی پیروی مت کرنا، تو یہاں صرف جسمانی والدین مراد ہیں یا روحانی والدین کے ماننے کے سلسلے میں بھی اِس میں کوئی حکمت ہے)؟

جواب: ہاں! اِس میں بھی تاویلی حکمت یوں ہے کہ روحانی والدین ہی کسی کو یہ بتا سکتے ہیں کہ انسان کی حقیقت اُس کی انا خدا ہے یا نہیں ہے اور پھر علم کی ضرورت ہے اور جب تک کہ علم نہیں ہے تو اُس کو نہیں ماننا چاہئے اور جب علم آتا ہے تو باور کرنا چاہئے۔ مثلاً شروع شروع میں جب رُوحانی انقلاب ہوتا ہے تو اُس تنزیل کی ایک ایسی جھلک ملتی ہے، جیسے انسان کی انا، خدا سے متعلق کہا جاتا ہے لیکن اِس میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ اُس وقت تم باور نہیں کرنا جب تک کہ تاویل کا زمانہ نہیں آتا ہے جب تک تم کو علم نہیں آتا ہے، تو پھر پختگی کے ساتھ اپنی انا کو یا کسی اور کو تم خدا مان سکتے ہو۔ جس طرح اب ہم مونوریالزم کے تحت علم کی روشنی میں اپنی اناؤں کو خدا سے واصل مانتے ہوئے مونوریالزم کو مانتے ہیں، تو یہ مونوریالزم کیا ہے۔ مونوریالزم کسی ایک فرد کو خدا ماننے کا نام نہیں ہے، بلکہ اِس میں بہت سی حقیقتوں کو یا کہ بہت سی اناؤں کو ایک حقیقتِ واحدہ ماننے کا نام ہے، تو اِس میں ایسا اشارہ ہے کہ اِس سے زیادہ اِس کی تشریح نہیں ہو سکتی ہے۔ شرط ہے وہ (conditional) ہے کوئی بھی بات قرآن میں (conditional) ہوتی ہے، تو لوگ اُس کو خیال میں نہیں لاتے ہیں، اُس (condition) کو نہیں سوچتے ہیں اور پھر اُس کی (negative side) میں جاتے ہیں۔ قرآن میں بہت سی باتیں ہیں جن میں کوئی شرط بھی ہے، مثلاً کسی دلیل کے بغیر، کسی علم کے بغیر، کسی سلطان کے [بغیر] وغیرہ، تو یہ ہے کہ انسان کی حقیقت خدا سے ملی ہوئی ہے مگر یہ بات ایک بے علم شخص کہے تو یہ جائز نہیں ہے۔ اِس آیت میں یہی تعلیم ہے اگر ایک شخص علم کے ساتھ ہے معرفت کے ساتھ ہے، تو اُس کے لئے جائز ہے یہ کہنا اِس میں یہ فرق ہے اور اِس میں اِس آیت کے اندر دو پہلو ہیں یا یہ کہ یہ بات مشروط ہے۔

ٹائپنگ: ثناوزیرعلی نظرِ ثانی: اکبرعلی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُر حکمت بیان

عنوان: قرآن کے مراکز۔ گوہرِ عقل

کیسٹ نمبر: Q-26　　　تاریخ: اکتوبر ۱۹۸۲ کراچی

Click here for Audio

آج قرآن کے بعض اُصولات کے بارے میں گفتگو کریں گے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ ہم قرآن کے اُصولات کے متعلق جانیں کیونکہ اِن اُصولات سے واقف و آگاہ ہونے سے قرآن کے سمجھنے میں بڑی حد تک مدد مل سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن بھی قانونِ فطرت کے مطابق اپنے مراکز رکھتا ہے، یعنی قرآن کی تعلیمات خاص مقامات پر جمع ہو جاتی ہیں، اور وہ کئی طرح سے ہے، جیسے اِس دنیا کے اندر ہم دیکھتے ہیں ایک درخت کو، کہ درخت جڑوں میں بھی پھیلا ہوا ہے اور شاخوں میں بھی پھیلا ہوا ہے، مگر وہ تنا میں جمع ہے اور یکجا ہے، اور اسی طرح ہم جب پانی کو دیکھتے ہیں تو پانی کا بھی ایک بڑا مرکز ملتا ہے وہ سمندر ہے، اور پھر پانی کی شاخیں ہیں، بادل ہو، بارش ہو، گلیشیر، برف، چشمے، ندّیاں، دریا، اور دنیا کی آبادی میں جہاں جہاں پانی ملتا ہے اور جس چیز میں بھی پانی ملتا ہے تو یہ پانی کی شاخیں ہیں۔

اسی طرح، ہم ایک اور خاص چیز کو اسی نظام کے مطابق اور اسی اُصول کے مطابق پاتے ہیں، وہ سورج ہے۔ سورج پر آپ نے غور کیا ہوگا کہ وہ کس طرح روشنی کے مواد کو بکھیر رہا ہے، سورج کے مرکز سے جیسے ہی دُور سے دُور تر جاتے ہیں، تو یہ روشنی یا کہ روشنی کے ذرّات جو کرنیں ہیں زیادہ سے زیادہ بکھری ہوئی ملتی ہیں۔ لیکن جب ہم سورج کے سرچشمے کی طرف جاتے ہیں، تو یہ ساری چیزیں نزدیک سے نزدیک تر ہوتی جاتی ہیں، اور آپس میں ملتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ سورج کے سمندر میں تمام روشنی سے متعلق چیزیں یکجا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح نسلِ انسانی کو دیکھیے، آج اِس زمانے میں جتنی انسانیت پھیلی ہوئی ہے اگر اس کی تاریخ کی طرف جائیں، تو اتنے سارے نفوس آگے سے آگے، آپس میں مختلف خاندانوں میں اور مختلف آباؤ اجداد میں، مختلف قومیتوں میں، قبیلوں میں ملتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ آدم پر جا کر سب آدمی ایک مرد اور ایک عورت سے منسلک ہو جاتے ہیں، اور اسی طرح قرآن دنیائے علم و حکمت ہے اُس کے اندر علم کی بے پایان چیزیں بکھری ہوئی ہیں، مگر جیسے ہم اُوپر سے اوپر جاتے ہیں، تو یہ تعلیمات و ہدایات مختلف مقامات پر یکجا ملتی ہیں اور اِن کی یکجا ملنے کے کئی طریقے ہیں، ایک تو یہ اسماء میں یکجا ملتے ہیں، خدا کے ناموں میں، پھر کلماتِ تامّات ہیں اور اِس کے علاوہ قرآن کے مراکز میں سے اساس ہے، اور ناطق، پھر اُس کے اوپر نفسِ کُلی ہے، پھر آخر میں عقلِ کُلی ہے، تو ظاہر بات

ہے کہ اِن چار اُصول میں قرآن یکجا ہے۔اساس میں اِس لئے کہ وہ کتابِ ناطق ہے، اور تنزیل کا مرکز ہے، ناطق میں اِس لئے کہ اُس پر اللہ کی کتاب قرآن نازل ہوا، نفس کُل میں اِس لئے یکجا ہے کہ وہ لوحِ محفوظ ہے اور عقلِ کُل میں اِس لئے قرآن یکجا ہے کہ وہ قلمِ الٰہی ہے۔

آج میں کچھ اچھے خیالات سے، گوہرِ عقل یعنی قلمِ الٰہی کے ناموں کو لکھ رہا تھا، اُس پر کام کر رہا تھا، یہ اس لئے کہ آسان سے آسان اور کم سے کم وقت میں قرآن کے علم کو سمیٹنے کے لئے ہر وقت ہم سوچتے رہے ہیں اور اس سوچنے میں بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے، کہ ہم نے بفضلِ خداوندی فہمِ قرآن سے متعلق مختلف طریقے اختیار کئے ہیں۔ جیسے قیامت کے نام، تو یہ قیامت کے نام علمِ قیامت سے متعلق مستقل عنوانات ہوں گے، جس طرح آپ جانتے ہیں کہ ایک پھیلا ہوا مضمون جو ہوتا ہے وہ اپنے عنوان میں یکجا ہوتا ہے۔ایک طرح سے آپ اپنے مضمون یا موضوع کا جو نام رکھتے ہیں وہ ایسا نام ہوتا ہے، اور اُس کا مفہوم کچھ اِس طرح سے ہوتا ہے کہ اُس کے اندر گویا کہ آپ کا پھیلا ہوا مضمون یکجا ہوتا ہے، اسی طرح اگر قیامت کے ناموں کا پتا چلے، تو ہر نام میں قیامت کا ایک پہلو بیان کیا گیا ہوگا، ہر نام میں قیامت کے ایک پہلو کا ذکر ہے، اسی طرح اگر ہم کو رُوح کے مخفی ناموں کا پتا چلتا ہے، تو ہر نام سے رُوح کی وضاحت ہوگی، رُوح کی تعریف و توصیف ہوگی، رُوح کیا ہے اِس کا بیان ملے گا، جیسے اگر کوئی لائق انسان ہے اور اُس کے دس بارہ ٹائٹلز ہیں، تو ہر ٹائٹل اُس کے ایک کام کو ظاہر کرتا ہے۔اسی طرح اگر رُوح کے ناموں کا علم ہو، تو رُوح کی حقیقتیں ظاہر ہو جائیں گی، چنانچہ آپ نے اِس بیان میں سنا کہ قرآن کے کئی مراکز ہیں لیکن سب سے زیادہ یکجا مرکز جو ہے وہ گوہرِ عقل ہے، تو گوہرِ عقل کے بھی اسی طرح بہت سے نام ہیں۔جس طرح دوسری اعلیٰ حقیقتوں کے کئی نام ہیں، اگر یہ نام درج ہو جائیں، اِن ناموں کا تذکرہ ہو، اُن کی وضاحت ہو تو ہم دیکھیں گے، کہ قرآن کا اندازِ بیان کیا ہے اور اُس کی حکمتوں کا حصول کیا ہے، وغیرہ۔

چنانچہ گوہرِ عقل جس کو قرآن نے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے، اور قرآن نے اُس کو لؤلؤ بھی کہا ہے، لؤلؤ موتی کو کہا جاتا ہے اور اس کو پوشیدہ لؤلؤ کہا ہے، پوشیدہ موتی، اِس لئے کہ عقل کا جو موتی ہے، عقل کا جو گوہر ہے وہ سارے جہاں والوں سے پوشیدہ ہے اور پوشیدہ کیوں نہ ہو جبکہ وہ کنزِ خدائی ہے یعنی خزانۂ خدا ہے۔اسی عقل کے قلم سے خدا نے کائنات کے ظاہر و باطن کو تحریر میں لایا ہے، اور اسی قلم کی تحریروں پر قرآنِ مقدّس مبنی ہے، اُس گوہر کا ایک اور نام نور ہے، کیونکہ وہی نور ازل اور ابد پر روشنی ڈالتا ہے، وہی سورج ہے جو طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے، جب عقل کا نور طلوع ہو جاتا ہے، تو صبحِ ازل ہو جاتی ہے اور جب غروب ہو جاتا ہے تو شامِ ابد ہو جاتا ہے یعنی وہ اپنے طلوع سے صبحِ ازل کو ظاہر کرتا ہے اور اپنے غروب سے شامِ ابد کو دکھاتا ہے۔ چنانچہ اُس کا ایک دن اتنا لمبا ہے جتنا کہ ازل سے لے کر ابد تک کا عرصہ، اور بڑی عجیب بات ہے کہ جب آپ قرآن میں غور کریں گے جیسا کہ غور کرنے کا حق ہے، تو اُس وقت آپ کو قرآن

کے ہر مقام پر گوہرِ عقل کی روشنی ملے گی، ساری آیتیں گوہرِ عقل کی حرکت کی تشریح کریں گی، اور پھر دل گواہی دے گا کہ بے شک یہ دین برحق ہے، قرآن برحق ہے، رسولؐ برحق ہے اور امامؑ برحق ہے۔ برحق کوئی شخص زبان سے بھی کہہ سکتا ہے اور برحق سوچ کر، سمجھ کر اور عقل کے مقام کا مشاہدہ کرکے بھی کہہ سکتا ہے مگر دونوں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ عقل کی روشنی ملنے کے بعد قرآن کے عجائبات ایسے ہیں، ایسے ہیں، کہ آپ کو جنّت کی لذّتیں، بہشت کی حلاوتیں اور عالمِ رُوحانیت کی ہر چیز علم و حکمت کی روشنی میں نظر آنے لگے گی۔ آپ باور کریں گے کہ تاویل کا تصوّر بالکل صحیح ہے، عقل کا ایک اور ٹائٹل کوہِ طور ہے، آپ کو کوہِ طور سے متعلق قصہ قرآن میں ملے گا، اور جب آپ کو یہ علم ہوا کہ کوہِ طور سے گوہرِ عقل مراد ہے، تو بہت سے حقائق آپ پر منکشف ہو جائیں گے، ساتھ ہی ساتھ اِن ناموں کے جاننے سے آپ پیغمبروں کو بھی پہچانیں گے، اُن کے رُوحانی مراتب کو، اُن کے مقامِ معرفت کو، اُن کے مقامِ قُرب کو۔ ایک حقیقی اسماعیلی قرآن پڑھتا ہے امامؑ کی تائید کے روشنی میں اور ایک عام شخص قرآن پڑھتا ہے، آپ بتائیں کہ کس کی نگاہوں میں قرآن کی زیادہ سے زیادہ عظمت ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اُس مردِ مومن کی نگاہوں میں قرآن کی عظمت زیادہ سے زیادہ ہے جو قرآن کی حکمتوں کو، بھیدوں کو یعنی اُس کے اسرار کو جانتا ہے۔

اہلِ ظاہر تو یہ کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی پتھر میں ماری جس سے بارہ چشمے ابلنے لگے اور اگر یہ ظاہری پانی ہوتا، اِس میں تاویل نہیں ہوتی، حکمت نہیں ہوتی تو اِس کے کیا معنی کہ الگ الگ بارہ چشمے اُس میں سے نکلیں۔ اگر صرف پانی پینا مقصود ہوتا، تو ایک چشمہ، چھوٹا نہ سہی بڑا سہی ہونا چاہیئے تاکہ سب لوگ مل کے اُس میں سے پانی پیئیں گے۔ اب بارہ کے عدد کی اِس میں کیا ضرورت تھی، ظاہر ہے کہ یہ عالمِ جسمانیت میں اساس ہے اور عالمِ رُوحانیت میں گوہرِ عقل ہے اور اُس کے اندر تعلیمات کے درجے مقرّر ہیں، پانی ہوتا تو ہر کوئی آسانی سے پی سکتا تو اِس کے پینے میں کیا دیر لگتی ہے۔ لیکن علم کا جو پانی ہے وہ سب کو یکسان نہیں چاہیئے، علم کی مختلف سطحیں ہونی چاہئیں تاکہ ہر شخص کے عقل و شعور کے مطابق ایک سطح پر رکھا جائے تاکہ اُس کو سمجھنے کے لئے آسانی ہو، یہ تقسیم اِس لئے، یہ درجات اِس سبب سے ہیں، اور گوہرِ عقل کے عجائبات میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ خداوندِ عالم نے ساری کائنات کو یعنی کائناتِ علم کو، کائناتِ دین کو گوہرِ عقل سے پیدا کیا، اور جب بھی وہ اِس مذکورہ عالم کو فنا کرے تو وہ فنا اِس طرح سے ہوگا کہ پھر یہ کائنات اسی گوہر میں سمو جائے گی۔ اب اِس مقام پر فنا کی ایک حقیقت مل گئی، جیسے شاید آپ کو یاد ہو کہ کبھی ہم نے سورۂ رحمان پر (lesson) کیا تھا اور شاید وہ لیکچر کیسٹ میں بھی موجود ہے، ہم نے فنا کی وضاحت اِس طرح سے کی تھی کہ اُس آیت کے اندر فنا کا ذکر آتا ہے، پھر اشارے سے فنا کو نعمت قرار دی جاتی ہے، اِس سے معلوم ہوا کہ فنا کی کئی قسموں میں سے یہ جو فنا ہے ایسی فنا نہیں ہے، کہ جس سے انسان نیست و نابود ہو جائے، مومن کو جاننا چاہیئے اور اپنے اصل مقام کو پانا چاہیئے، خود کو عوام سے اور عام سطح سے بلند کر لینا چاہیئے۔

میرا مقصد ہے کہ وہ جو عوام کہتے ہیں اُس کی پیروی نہ کرے، وہ اپنے دین کی حقیقتوں کو اور معرفتوں کو پائے، وہ فنا و بقا کی حقیقت کو سمجھے کہ فنا کئی طرح سے ہے، ہلاک بھی اور فنا بھی، ایک فنا یا کہ ہلاکت ایسی ہے کہ اُس میں کوئی چیز یا کوئی رُوح یا کوئی شخص یا کوئی وجود نیست اور نابود ہو جاتا ہے، پھر اُس کے اجزا بکھر جاتے ہیں اور کوئی چیز اُس سے باقی نہیں رہتی ہے، ایک فنا اور ایک ہلاکت کی یہ کیفیت ہے، اِس کے برعکس دوسری فنا یا کہ دوسری ہلاکت ایسی ہے، کہ اُس میں چیز کو عروج ملتا ہے، ترقّی ملتی ہے، جیسے ریشم کا کیڑا ہے وہ فنا ہو جاتا ہے، ہلاک ہو جاتا ہے کہنے کو یہ لفظ بالکل صحیح ہے، کیڑا جو ہے وہ مر جاتا ہے یا کہیں کہ ہلاک ہو جاتا ہے یا مانیے کہ فنا ہو جاتا ہے، ایک طرح سے۔ لیکن وہ کب اِس طرح سے فنا ہوتا ہے کہ جس میں وہ نیست و نابود ہو جائے، یہ فنا ہے بھی اور نہیں بھی، ہے اِس لئے کہ اُس کی جو پہلی حیثیت ہے وہ ختم ہو گی اور نہیں اِس لئے کہ اس کو ایک نئی حیثیت ملی، نئی ہستی ملی، نیا وجود ملا، تو سورۂ رحمان میں اِس دوسری فنا کا ذکر ہے، جس میں بہتری ہے، جس میں ترقّی ہے۔ چنانچہ جب پوری کائنات گوہرِ عقل میں فنا ہو جاتی ہے تو اُس صورت میں کائنات گوہرِ عقل میں زندہ ہو جاتی ہے، اپنے وسیع وجود سے یا اپنی پہلی ہستی سے بے شک وہ فنا ہو جاتی ہے لیکن اُس کو عقلی وجود ملتا ہے۔ جب عقلی وجود ملتا ہے، تو اُس کے لطف کی کیا بات کریں، اُس کی خوبیوں کی، اُس کی خوبصورتیوں کی، اُس کے حسن و جمال کی، اُس کی لذّتوں کی، اُس کی حلاوتوں کی، اُس کی حکمتوں کی کیا بات بتائیں۔ عقل بن جائے تو عالمِ عقل میں، عالمِ عقول میں جائیں تو ہر چیز عقل بن جاتی ہے، تو نور بن جاتی ہے، جس طرح اِس کائنات کے مختلف اجزاء یا ذرّات سورج میں ایندھن کے طور پر بھر جاتے ہیں، تو وہ نور ہو جاتے ہیں۔ جس طرح ایک کوئلہ آگ کی بھٹّی میں پڑتا ہے تو وہ روشنی بن جاتا ہے، اسی طرح جب ہم سارے قرآن کو آئینۂ گوہرِ عقل میں دیکھتے ہیں تو پھر بہت ہی حکمت کا تصوّر ملتا ہے اور بہت ہی اُس میں عجائبات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔

بڑی عجیب بات ہے کہ موسیٰ نے خداوندِ تعالیٰ کے حضور میں بڑے دیدار کے لئے گزارش کی تو خداوند نے فرمایا، کہ تم مجھ کو نہیں دیکھ سکو گے، پھر فرمایا کہ دیکھو میں اپنی تجلّی اِس پہاڑ پر ڈالتا ہوں، اگر یہ پہاڑ میری تجلّی کو برداشت کرتا ہے تو بے شک تو مجھ کو دیکھ سکے گا، تو جب خداوندِ عالم نے پہاڑ پر تجلّی ڈالی تو پہاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور موسیٰ بے ہوش ہو گیا۔ یہ مقامِ عقل کا ایک کرشمہ ہے اور مقامِ عقل کی بات ہے، یہاں پہاڑ سے مراد گوہرِ عقل ہے اور دیدار سے مراد بڑا دیدار ہے، چنانچہ جب خداوندِ عالم نے گوہرِ عقل پر تصرّف کیا تو اُس کے علمی طور پر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے یعنی اُس میں سے بہت سے علوم کا ظہور ہو گیا یعنی اُس کا علمی (analysis) وغیرہ، علمی تجزیہ ہو گیا، اور علم کے بہت سے جواہر پارے اُس سے بکھر گئے، جب خدا نے علمی اور حکمتی جلوہ اُس پہ ڈالا، تو گوہرِ عقل سے بہت سارے جواہر پارے، علم کے بکھر گئے اور موسیٰ کے بے ہوش ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں، کہ وہ مادّی طور پر گر گیا بے ہوش ہو کر، بے ہوش سے یہاں حیرت مراد ہے

اس عالم میں موسیٰ نے جو کچھ دیکھا وہ حیران کن بات تھی، کوئی عقل میں آنے والی بات نہیں تھی، یعنی وہاں کے عجائب و غرائب کا ذکر ہے کہ موسیٰ کو یہ کرشمہ اور یہ (demonstration) گوہرِ عقل سے متعلق بہت ہی عجیب لگا۔ ایسا گر انہیں جس طرح لفظی طور پر یوں لگتا ہے یا لوگ مانتے ہیں، قرآن میں ہے کہ: ''لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ'' (۲۱:۵۹) اگر میں یہ قرآن پہاڑ پر نازل کرتا، تو تم دیکھتے کہ پہاڑ کی کیا حالت ہوتی، وہ دب جاتا خدا کے ڈر سے اور اُس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے، یہ بھی وہی بات ہے، جب خدا نے علم وعرفان کا قرآن گوہرِ عقل پر نازل کیا، تو بالکل ایسا ہی ہو گیا جیسا کہ اِس آیت میں ذکر ہے۔ یہ گوہرِ عقل کی حکمتیں ہیں، اور میں سچ کہتا ہوں ہر حکمت، اتنی عظیم ہے، اتنی عظیم ہے، کہ آپ کو آج نہیں تو کل یا اُس کے بعد جس قدر بھی آپ علم میں بلندی پر جائیں گے اُس قدر اس کی عظمت کا آپ کو اندازہ ہوگا، یہ ہے کہ قرآن کی حکمتوں کو ممکن ہونے کی صورت میں بھی قبول نہ کرنا میرے خیال میں صرف سُستی نہیں ہوگی بلکہ ناشکری بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن کی حکمتوں سے خاطر خواہ مستفیض ہونے کا جو موقع ہے وہ صرف اور صرف اسماعیلی مذہب میں ہے، اِس لئے میں ہر وقت آپ کو ترغیب دیتا ہوں، قرآن فہمی کے سلسلے میں اور اُمید ہے کہ کچھ عرصے کے بعد رفتہ رفتہ آپ کے پاس قرآنی علم کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو جائے گا اور اُس وقت آپ اپنے اُوپر بہت بڑا اعتماد رکھیں گے قرآن کی طرف سے، کیونکہ جس اُصول سے ہم نے قرآن فہمی کے لئے شروع کیا ہے وہ بڑا زرّین اُصول ہے، بہت مفید ہے کہ ہم بلندی سے قرآنی علم کو (cover) کرنا چاہتے ہیں اور ایک ہی نکتے میں قرآن کی بہت ساری باتیں یا حکمتیں آسکتی ہیں، اور ہم نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے، کہ ایک بات بتائیں جو قرآن میں بہت سی جگہوں میں آئے، مثال کے طور پر انہی گوہرِ عقل کے ناموں میں سے ایک نام حق ہے یا کہ الحق ہے، یہ قرآن میں (۲۲۷) دفعہ آیا ہے۔ اسی طرح مثال کے طور پر اگر ہم اسم اللہ کے بارے میں کسی حکمت کو حاصل کرتے ہیں تو یہ ہماری حکمت ہزار جگہوں میں کام آئے گی کیونکہ اللہ کا جو نام ہے وہ تقریباً ایک ہزار جگہوں میں آتا ہے، تو ہم نے تعلیمِ قرآن سے متعلق اِس اُصول کو شروع کیا ہے۔

ابھی میں بتا رہا تھا کہ حق جو ہے گوہرِ عقل کے ناموں میں سے ہے، حق کے معنی مطابقت، موافقت اور سچائی بھی اور سچ بھی، اور دوسری بات یہ ہے، لوگ قرآن کے کسی معنی کو اِس طرح سے لیتے ہیں کہ اُن کا کیا ہوا معنیٰ جو ہے وہ ادھورا رہتا ہے، وہ چند قدموں کے بعد ختم ہو جاتا ہے، لیکن امامؑ کے خزانے سے جو قرآنی لفظوں کے معنی ملتے ہیں وہ ایسے کامل اور مکمل ہیں کہ معنوں کی انتہائی بلندی تک پہنچتے ہیں، مثلاً ہمارے یہاں سب سے اعلیٰ مقام یا کہ بلند ترین علمی درجہ جو ہے وہ گوہرِ عقل ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ امر ہے یا کلمۂ باری ہے، جو ساتھ ہے۔ اِس سے کوئی چیز آگے نہیں جاتی ہے، ہم کبھی امر پر بھی بات چیت کریں گے، امر اور عقل، امر کا مطلب کلمۂ کُن ہے اور عقل کا مطلب اِس کُن کا نتیجہ ہے جو ساتھ ہے، تو میں یہ

بتانا چاہتا تھا کہ ہم نے جوکوشش شروع کی ہے وہ ایسی کوشش ہے کہ معنوں کو اور مطالب کو، مفہومات کو ہم بلندی سے (cover) کرنا چاہتے ہیں ۔جو نچلی چیزیں ہیں وہ خودبخود (cover) ہو جاتی ہیں، چنانچہ ہم جب گوہرِ عقل کی بات کریں گے، تو اِس کے علمی احاطے میں یا علمی گھیرے میں ہر چیز آجائے گی اور کوئی چیز اس سے باقی نہیں رہے گی۔کبھی ہم آپ کو قرآن کھول کے اِس کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں، آپ کو تعجب ہوگا کہ امامؑ کے خزانے سے جو علم استعمال ہوتا ہے اُس کی کیا شان ہوتی ہے، اُس کی کیا کیفیت ہوتی ہے، کاش! آپ کم سے کم پچاس برس کے ہوتے اور [اور آپ نے] اِن تمام برسوں میں دنیا کی ساری تفسیریں پڑھ چکی ہوتیں ۔اسلام کے اُونچے فلسفے کو یا بہت سے مفسرّین کی آراء کو دیکھ چکے ہوتے اور ساتھ ہی ساتھ بزرگانِ دین کی کتابوں کو بھی پڑھے ہوتے، تو تب آپ کو اندازہ ہوتا کہ اسماعیلی علوم کیا ہیں؟ امام کے خزانے کی تعلیمات کیسی ہیں، اُن کی کیا شان ہے، اُن کی کیا عظمت ہے، اُن کی کیا بزرگی ہے؟ تو ضرور آپ کو اِس کا اندازہ ہوتا، لیکن میں مایوس نہیں ہوں، اِس وقت بھی آپ جانتے ہیں ۔میں یہ بات اِس طرح سے اِس لئے کرتا ہوں تاکہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ تفاسیر سے یہ چیزیں ملتی ہیں، اسماعیلی علوم کو پڑھنے کے بعد ظاہری علوم کا مطالعہ کرنا جو ہے ایک بڑا تماشہ بن جاتا ہے، کہ اُس میں سے کچھ نہیں ملتا ہے ۔آوارہ گردی کے سوا کچھ نہیں ہے، اور قرآن میں قیامت سے متعلق جو کچھ فرمایا گیا ہے اُس میں نظریات کی بات ہے اور کوئی چیز نہیں، بہت سی مثالوں میں نظریات کے متعلق آخری فیصلہ کس طرح ہوگا اور کیا ہوگا اُس کا ذکر ہے، اور قیامت کے مختلف ناموں میں بھی یہی بات چلتی ہے ۔

عجیب بات ہے کہ چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (٦٦٦٦) آیتوں میں ایک ہی مضمون چلتا ہے، ایک ہی مثال، ایک ہی بات ہے اور ایک ہی امام کی امامت کا ذکر چلتا ہے اور پھر سمت مخالف کی بات ہے بس! دو فریق ہیں ۔جہاں کہیں کوئی مثال ہے تو آپ کو وہ دو حصوں میں ملے گی، قرآن کی تمام مثالوں میں دائمیت کا تصور ملے گا یعنی یہ تو آپ جانتے ہیں کہ خدا کی رسّی کا ذکر ہے اور اُس میں دائمیت کی بات ہے یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ نورِ خدا کا ذکر ہے، کہ وہ کبھی بجھنے والا نہیں ہے، یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ خدا کا جو رستہ ہے وہ کہیں پر ختم نہیں ہوتا ہے اور جا کر منزلِ مقصود پر ختم ہو جاتا ہے، تو دیکھا اِن تین، چار مثالوں میں دائمیت کی بات ہے اور پھر درخت کی بات ہے کہ وہ ہمیشہ پھل دیتا ہے، اِس میں بھی دائمیت کی بات ہے، ہمیشگی کی بات ہے، اور روشنی سے متعلق جتنی مثالیں ہیں اُن میں دائمیت کی بات ہے، اِس کا جو (opposite) ہے اُس کی اِس میں تردید ہے یعنی مفہوم یہ ہے کہ خدا کے نور کو تو ہمیشہ ہونا چاہئے ۔اِس کی (logic) یہ بنتی ہے کہ جو کبھی ہو اور کبھی نہ ہو وہ خدا کا نور نہیں ہوسکتا، جو ایک شان سے ہو اور ہمیشہ کے لئے جو چیز ہے، جو حقیقت ہے، جو نظریہ ہے وہی خدائی نور ہے اور جس طرح ایک کسی مسافر کے آگ جلانے کی بات قرآن میں آگئی ہے (١٧:٢) جسکو آپ نے پڑھا ہے کہ کسی جنگل میں کوئی شخص آگ جلاتا ہے تو وہ تھوڑی دیر کے لئے ہے اور چلنے کے لئے وہ روشنی کام نہیں آتی ہے، اِس میں بھی

دائمیت کی بات ہے،تو میں نے کہا تھا کہ قرآن میں جتنی مثالیں ہیں اُن کے دو پہلو ہیں اور جو اصل پہلو ہے، جو مقصود ہے وہ اِس میں دائمیت کی بات ہے، اور اُس کے سامنے جو پہلو ہے یا اُس کی جو ضد ہے وہ دائمیت نہیں ہے، وہ عارضی چیز ہے، جیسے قرآن نے فرمایا کہ: ''وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا''(۸۱:۱۷)حق آگیااور باطل چلا گیا، اور باطل کے وُجود کو تو ختم ہو جانا چاہئے اور باطل کو دائمیت نہیں ہے، تو جو آج حق ہے وہ ہمیشہ قائم و دائم ہے اور جو باطل ہے تو وہ باطل ہے اور اُس کا مستقل وجود نہیں ہے، باطل کا۔ یہی قصہ قرآن میں چلتا ہے مختلف اندازوں سے، مختلف طریقوں سے اور مختلف مثالوں میں یہی بات ہوتی ہے، اگر ہم قرآن کے لئے اِس طرح سے میدان بنائیں اور اُس کے اُصولات کو سمجھیں اور اُس کے قواعد کو سمجھیں تو ہمیں آسانی ہو سکتی ہے۔ کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے اُس کی تعریف و توصیف چاہئے، اگر وہ چیز اعلیٰ ہے اور کیوں نہ کہیں کہ وہ اعلیٰ ہے، اور اگر ہم مانتے ہیں کہ کل جس جنّت کے حاصل کرنے کے ہم دعویٰ رکھتے ہیں یا اُمیدوار ہیں تو وہ جنّت مادّی نہیں ہے، علمی ہے اور اُس کے حصول کی شرط یہ ہے کہ ہم دنیا میں اِس کی شناخت حاصل کریں اور علم الیقین کے مقام پر ہم بصیرت پیدا کریں۔

جب ہم علم الیقین کے مقام پر اپنے اندر ایک آنکھ پیدا کریں گے تو ہم مستحق ہوں گے، حقدار ہوں گے کہ ہم کو وقت پر عین الیقین بھی عطا کر دی جائے گی۔ کیونکہ قرآن کا ایک کلیّہ ہے، ایک اُصول ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو یہاں اندھا رہے گا وہ قیامت میں بھی اندھا رہے گا اور یہ کئی طرح سے ہے (۷۲:۱۷)۔ ایک تو اِس میں سب سے پہلی بات امام کی شناخت سے متعلق ہے اور دوسری بات یہ ہے، کہ ہمیں یہاں جنّت کی نعمتوں کا بھی تجربہ ہونا چاہئے اور وہ علمی حیثیت میں ہیں، جیسا کہ آپ مانتے ہیں کہ وجود و (existence) جو ہے وہ تین (۳) ہیں، جسمانی وجود: جو ادنیٰ ہے، رُوحانی وجود: جو اِس سے اعلیٰ ہے، عقلی وجود: جو اُس سے برتر ہے جو سب سے بلند ہے، تو نعمتیں بھی اسی طرح سے ہیں، لذّتیں بھی اسی طرح سے ہیں۔ ہم کو سب سے پہلے جسمانی نعمتوں سے مانوس کر دیا گیا ہے تا کہ اِن نعمتوں سے ہم رُوحانی نعمتوں کی مثال لیں جو اعلیٰ ہیں اور عقلی نعمتوں کو سمجھیں جو سب سے اعلیٰ ہیں، تو جنّت اگر لوگوں کے کہنے کے مطابق مادّی نعمتوں سے پُر ہے تو پھر وہ کیا جنّت ہوئی؟ یہ بات اگر ہے تو وہی لوگ آج جنّت میں ہیں جو اِس مادّی دنیا کے اندر راحت میں ہیں، جن کے پاس دولت کی فراوانی ہے، جن کے پاس مادّی طور پر سب کچھ ہے، وہ جنّت ہے لیکن یہ بات کیسے ہو سکتی ہے، کہ خدا کی ساری قدرت یہی ہو اور اُس کی حکمت اسی میں محدود ہو کہ اُس نے ایک مادّی دنیا بنائی اور مادّی چیزیں پیدا کیں اور مادّی لذّتیں بنائی اور مادّی نعمتیں اُس نے پیدا کیں۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مادّی چیز جو ہے وہ بہت ہی ادنیٰ چیز ہے اور اُس کے ادنیٰ ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے، کہ دنیا میں انسان کے علاوہ بہت سے جانور ہیں جو بہت طاقتور ہیں اور دنیا کی چیزیں وہ کھاتے ہیں، مثلاً شیر ہے یا کتّا ہے اور دوسرے شکاری پرندے ہیں اور درندے ہیں یا وہ چرنے

والے جانور ہیں، جن کو جسمانی طور پر بہت کچھ ملتا ہے اور بہت ہی وہ (powerful) بھی ہیں اور اُن کو دنیا کے اندر غذائیں ملتی ہیں، تو پھر کیا فرق ہے انسان بھی خوراک کھاتا ہے اور جانور بھی کھاتے ہیں، تو کیا خدا کو چاہئے کہ ایسی نعمتوں کی وہ تعریف کرے جو جانوروں کو بھی حاصل ہیں۔ اسی لئے پیر ناصرِ خسروقس نے فرمایا کہ

نعمت نبود آنچه ستوران بخورندش نے ملک بود آنچه بدست آردش قیصر

نعمت وہ نہیں ہے جو جانور بھی کھاتے ہیں، بادشاہی وہ نہیں ہے جو قیصر بھی حاصل کرسکتا۔ آج کافروں کے پاس بادشاہت، آج کافروں کے پاس نعمت ہے مادّی قسم کی، آج جانور بھی بہت ساری چیزیں کھاتے ہیں، پیتے ہیں۔ آج حیوان بھی بہت ساری مادّی چیزوں کو کھاتے ہیں، پیتے ہیں لیکن کیا یہ نعمت ہے؟ اور بہشت میں کیا یہی پھل ہوں گے؟ اور یہی چیزیں ہوں گی؟ نہیں! نہیں! وہاں پر تو لطیف چیزیں ہیں، وہاں پر لطیف چیزیں ہیں، رُوحانی اور عقلی چیزیں ہیں، بہشت تو عقل و جان کی ہے، وہاں کوئی مکان ہے وہ بھی زندہ ہے۔ آپ جب بہشت میں جائیں گے، تو کس طرح جائیں گے، آپ کو بنا بنایا ایک بنگلہ ملے گا اور آپ رُوح سے جائیں گے، جسمانی طور پر نہیں، رُوح کے ذرّے سے جائیں گے تو آپ کا بنا بنایا جو بنگلہ ہوگا وہ ایک عظیم فرشتہ ہوگا یا ایک رُوحانی ہوگا، یا حدودِ دین میں سے ہوگا، یا پیغمبر ہوگا یا امام ہوگا یا اساس ہوگا یا اور کوئی ہوگا جو اعلیٰ درجے کا ہو، تو آپ کے وہاں جانے تک اُس نے ازل اور ابد کی سب چیزوں کو دیکھا اور پایا ہوگا، یعنی آپ کے بنگلے میں داخل ہونے تک آپ کے مکان میں سب کچھ کیا ہوگا تیار، ہم اِس کو کیوں نہ مانیں کہ آپ کی انائے علوی ہوگی وہاں پر۔ بس جس طرح ایک انسان خواب سے بیدار ہوتا ہے، اور بیدار ہو کر کسی ایسے خواب سے جس میں کہ اُس کو دُکھ ہو رہا تھا، تکلیف ہو رہی تھی، جب ایسے خواب سے آدمی بیدار ہو جاتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے، شکر ہے کہ وہ میری کوئی مستقل حالت نہیں تھی، بلکہ خواب تھا تو ابھی میں بیدار ہوگیا، تو اُس سے مجھ کو چھٹکارا مل گیا، میں اپنی حقیقی زندگی اور حقیقی شعور کی طرف آیا، تو اُس وقت دُنیا کی زندگی مختصر ترین لگے گی۔

بعض آیات میں ہے کہ وہ دُنیا کی زندگی ایک دن کی زندگی لگے گی، بعض آیات میں ہے کہ ایک گھنٹے کی زندگی لگے گی۔ اِس میں کیا حکمت ہے؟ دیکھیں کہ کسی وقت کے کوتاہ ہونے یا لمبے ہونے کا اشارہ یوں ہے، کہ جب انسان کو راحت میسر آتی ہے تو دن جو ہے وہ چھوٹا ہوتا ہے، جب دکھ ہوتا ہے تو دن لمبا ہوتا ہے۔ جب مومن بہشت میں جائے گا یا قیامت میں جائے گا، تو اُس وقت اُس کی یہ مادّی زندگی مختصر ترین لگے گی کہ رحمت ہے، مہربانی ہے کہ وہ یعنی دُنیا کے دکھوں کو بھول جائے گا۔ اگر اُس کی عمر سَو برس کی تھی یا ہزار برس کی تھی اور تمام زندگی میں اُس نے دُکھ اُٹھایا تھا تو وہ دکھ اُس کے لئے اب اِس قدر آسان ہو جائے گا اور ایسا فراموش کرے گا، اُس کو نظرانداز کرے گا کہ وہ ایک گھنٹے کا وقت قرار پائے گا اُس کے لئے۔ اسلئے تو میں نے کہا کہ وہ آپ کی انائے علوی کیوں نہ ہو، مولا ہو، خداوند ہو، پیغمبر ہو، اساس ہو اور کوئی عظیم

فرشتہ ہو یا اور کوئی ہستی ہو، کوئی بھی ہو وہ آپ کی انائے علوی، تو انسان کی دوانائیں صحیح ہیں، انسان کی رُوح کے متعلق مستقر اور مستودع صحیح ہے، مستقر وہاں پر ہے، مستودع یہ زندگی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم بھول جائیں، ماننے لگیں گے، باور کریں گے کہ ہم کبھی دُنیا میں گئے ہی نہیں، ہم نے صرف (approach) کیا، ہم نے صرف دُور سے یعنی دُنیا کو ہاتھ لگایا تھا، ہمارا چھاؤں [سایہ] گیا تھا، ہم کب گئے تھے، تو بہشت میں دائم رہنے کا جو تصور ہے اِس طرح سے ہے۔ ہمیں اتنا اچھا لگے گا کہ ہم کہیں گے کہ ہم ہمیشہ بہشت میں ہیں ہی، اپنے انائے علوی میں ہیں ہی، لیکن ہم نے اپنے (shadow) سے دُنیا تک رسائی کی تھی اور وہاں سے ہم نے ایک جدید علم لایا، تجزیہ کرنے کے لئے، جدید مسائل لائے، بہت سے مسائل، بہت سا مواد، بہشت میں آرام سے رہ کے اِن تمام مسائل پر گوہرِ عقل کی روشنی ڈالیں گے۔ اگر ہم کو دُنیا کے اندر کسی استاد نے کوئی اچھی بات، صحیح بات بتائی ہے، تو ہم بہشت میں اُس پر روشنی ڈال کے خوش ہو جائیں گے، سمجھنے لگیں گے کہ صحیح بات ہے، خوشی ہوگی، اگر کوئی بات ایسی ہے کہ کسی طرح سے سوال کی صورت میں ہے، تو اُس پہ عقل کی روشنی ڈالیں گے، تو پھر بھی خوشی ہوگی، دونوں صورتوں میں خوشی، اور اگر ہم نے کوئی کمزور بات اپنائی تھی تو وہاں وہ کمزوری علم کی دُور ہو جائے گی اور اس سے روشنی ملے گی، پھر بھی خوشی ہوگی۔

اس طرح کرتے کرتے علم کے طور پر تجزیہ کریں گے ہر چیز پہ، کائنات کے ظاہر و باطن پر اور قرآن پر، چونکہ علم کا جو سمندر ہے وہ بے پایان ہے اور اُس کے لئے بہت وقت لگے گا، پھر اِس کے علاوہ وہاں پر جو ہے رُوحوں کو درس دینا ہوگا، ملائکہ کو سکھانا ہوگا جس طرح آدم نے یہ تصور دیا، آدم کا جو قانون ہے وہ دین کا جز ہے، ایسا نہیں ہے کہ یعنی آدم پر جو واقعہ گزرا تھا، اُس نے جو ملائکہ کو درس دیا تھا، یہ قانونِ الٰہی سے اور دینِ خدا سے، دینِ فطرت سے الگ تھلگ کوئی بات ہو، یہ بات نہیں ہے، یہ ہمارے لئے اشارہ ہے، آدم کے قصے کو (lesson) کے سب سے آگے، سب سے اُوپر کیوں رکھا ہے؟ وہ تو (common) ہے، وہ (general) ہے، اور تمام پیغمبروں نے اپنے اپنے وقت میں یہ کام کیا، ”لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ “(۲:۲۸۵) یہ ایک مختصر سی آیت ہے لیکن اِس کے اندر یہ تصور ہے، کہ ایک پیغمبر کو ہم دوسرے پیغمبر سے جدا نہیں سمجھتے ہیں کا مطلب یہ نہیں ہے، کہ ظاہری درجے میں ہم کچھ فرق نہیں کرتے ہیں۔ ظاہری درجہ صحیح ہے، کوئی بڑا ہے تو کوئی چھوٹا ہے، لیکن اِس کا مطلب یہ ہے کہ قانون ایک ہے، اِس کا مطلب یہ ہے کہ سلسلہ ایک ہے، (chain)[سلسلہ] آیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اِن سب کا مقصد ایک ہے، اور اِن سب کی دعوت ایک ہے اور اِن سب کا دین ایک ہے، اِن سب کی رُوحانیت ایک ہے، تو آدم کی رُوحانیت سب میں مشترک تھی، تو تمام انبیاء کے اندر وہی دینِ فطرت کارفرما ہے، سب کا قانون ایک ہے۔ لہٰذا بہشت کچھ اِس صورت میں ہوگی کہ وہاں پر زیادہ سے زیادہ علم کام آئے گا، اِس لئے کہ ملائکہ کو تعلیم دینی ہوگی، ساری کائنات کی رُوحوں کو درس دینا ہوگا۔ وہی رُوحانی سلطنت ہوگی اور

رُوحانی سلطنت دُنیا کی سلطنت سے بہت ہی مختلف ہے، اُس کو آپ خلافت کہیں، رُوحانی سلطنت کہیں، اِس کے لئے علم کام آئے گا اور علم دنیا سے بڑھ کر آخرت میں کام آتا ہے، اور علم چونکہ نور ہے، اور نور نہ صرف دُنیا میں کام آتا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ آخرت میں کام آتا ہے، دُنیا میں صرف ایک پروگرام متعیّن ہو جاتا ہے، دنیا میں صرف شناخت ہوتی ہے، دنیا میں صرف (direction) ملتی ہے، کہ ہم کو کس طرف جانا ہے اور ایک نصب العین مقرر ہوتا ہے۔ سارا کام آخرت میں ہے یعنی رُوح اور عقل کا کام اور سارا علم آخرت میں ہے، لیکن علم اُس کو ملے گا جس نے اپنی عقل کی پرورش یہاں علم سے کی ہو، جس نے علم کی نعمتیں چکھی ہوں، جس نے علم کو دیکھا ہو اِس کے بغیر نہیں، لہٰذا پُر امید رہیے، ہم اِس کام کو بفضلِ مولا کرتے رہیں گے، کچھ کتابوں سے، کچھ کیسٹوں سے، کچھ تحریروں سے، کچھ خطوط سے، کچھ لیکچروں سے، اور یہ کام ہوتا رہے گا لیکن یہ کام مرحلۂ اوّل پر ہو چکنے کے بعد ہماری یہ نیّت ہے کہ ہم جس قدر بھی ہو سکے اسماعیلی جماعت میں اِن باتوں کو پھیلائیں گے اور ابھی ابھی گلگت کے کچھ دوستوں نے گزارش کی ہے یہاں جو پرچے بنتے ہیں یا علمی خطوط قرآن سے متعلق اُن کی وہاں بھی سخت ضرورت ہے، تو آپ نہ صرف ذاتی طور پر اِس کو حاصل کریں بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی اِس کے پہنچانے کے لئے کوشش کریں۔

ابھی میں اِس گفتگو کو ختم کرتا ہوں اور میں منتظر ہوں کہ آپ میں سے کسی کو کوئی سوال ہو، اِس گفتگو سے متعلق کوئی سوال پیدا ہوا ہو، تو ہم اُس کے جواب کو دینے کی کوشش کریں گے، شکریہ۔

ایک نظام ہے یہ دنیا کے اندر بارہ جزیرے ہیں یعنی دنیا کے بارہ حصے ہیں یا یہ کہ دنیا کے اندر بڑی بڑی قومیں جو ہیں وہ بارہ ہیں، اُن بارہ قوموں کے اندر کچھ لوگ پیدا ہوتے ہیں جو رہنما قسم کے ہوتے ہیں اور وہ امام کے زیرِ اثر ہوتے ہیں اور رہبر، اُن کا نام حجّت ہے، وہ حجج ہیں، حجّت کی جمع حجج اور اُن میں سے ہر حجّت کے اندر تیس داعی بھی ہوتے ہیں اور یہ سال کے بارہ مہینے اور تین سو ساٹھ دنوں کی مثال ہیں، تو اسی طرح دُنیا (cover) ہو جاتی ہے۔ اِس میں اصل سوال آپ کا کچھ یوں ہے، کہ آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ظاہری طور پر یہ کس طرح ممکن ہے جب تک کہ دنیا کے افرا[کثرت] ایسے ہیں کہ بظاہر ہمیشہ یہ ممکن نہیں ہے، کہ جسمانی طور پر کوئی چل کے اِس طرح سے منظّم یعنی تقسیم اور (division) بنائے، تو میں اِس میں یہ کہوں گا کہ یہ سب کچھ جسمِ لطیف کی بات ہے اور جسمِ لطیف کے اندر امام کی بادشاہی ہے اور اُس امام کی بادشاہی کے نظام کے تحت یعنی یہ سب کچھ ہوتا ہے، اور وہ جو حجّت ہیں وہ بھی ہمیشہ لطیف جسم میں کام کرتے ہیں، جس طرح ہم یہ مانیں گے کہ (suppose) کہ آپ حجّت ہیں، آپ حجّت ہیں تو آپ کو جسمِ لطیف میں کام کرنے کی صلاحیت مل جائے گی، اور آپ کو دُنیا کا ایک جزیرہ ملے گا، آپ کا لطیف جسم جا کے وہاں یعنی اُس جزیرے کے اندر، اُس (community) کے اندر، اُس قوم کے اندر، اُس ملک میں وہ دن رات کام کرے گا اور اُس کا لوگوں کے ساتھ (link) ہو گا، لوگوں کے

ذہن میں اچھی باتیں ڈالنا یہ رُوحانی ہدایت کا، امام کی توصیف کا۔ جس طرح اِس کی (opposite) میں شیطان برائی پھیلاتا ہے، تو اسی طرح جو ہادیٔ برحق ہے اُس کو بھی (approach) ہے برابر، برابر کا (approach) ہے، اور قرآن کا یہ اُصول ہے کہ بعض چیزیں (secret) رکھنے کے لئے یعنی کہ بعض دفعہ اِس پہلو کو اُجاگر کیا جاتا ہے تاکہ اُس (opposite) کو سمجھیں، بعض دفعہ اِس کو چھوڑ کے اُس کو اُجاگر کیا جاتا ہے تاکہ دانا جو ہے اُس پر اس کا قیاس کرے، مثال کے طور پر شیطان کے متعلق یہ تو واضح ہے، کہ شیطان کو اتنی آزادی ہے کہ وہ جہاں بھی چاہے اُن کے دل میں وسوسہ ڈال سکتا ہے، تو وسوسہ ڈالنا کچھ خدا کا تو کام نہیں ہے نا! اب اگر ہم خدا کے تصور کو بہت بلند مانیں تو پھر شیطان کے (opposite) میں خدا کو نہیں آنا چاہئے، یہ تو بہت یعنی کمتر بات ہوگی کہ خدا جو ہے یعنی شیطان کا (opponent) ہوجائے، شیطان کے مقابل میں وہ آنا چاہئے جو ہادی ہے، عربی کے دو (words) ہیں، ایک مضّل ہے گمراہ کن، ایک ہادی ہے، یہ مضّل کا جو ٹائٹل ہے شیطان کا ہے اور یہ جو ہادی کا ٹائٹل ہے یہ امام کا ہے۔ اب (opponent) کی بات کریں تاکہ جو ہے اِس طرح کی بات سمجھ آئے، کہ شیطان کا لشکر ہے، تو ہادی کا بھی لشکر ہے، شیطان اکیلا یہ کام نہیں کرتا ہے، اُس کا بڑا لشکر ہے، یعنی شیطان کے نیچے شیاطین ہیں یا کہ ابلیس کے نیچے شیاطین، تو اُس کے مقابلے میں ہادیٔ برحق کے نیچے حجت ہیں، داعی ہیں، لشکر ہے بڑا، تو لہٰذا جس طرح شیطان کو (approach) دیا ہوا ہے، اُس کو پوری دنیا کے اندر یعنی آنا جانا ہوتا ہے، وہ بھی لطیف جسم رکھتا ہے، شیطان چاہے، وقت ہو تو کسی آدمی کے سامنے اُس کا ظہور ہوسکتا ہے، اسی طرح امام کا بھی جسمِ لطیف ہے اور اُس کے جو حدود ہیں اُن کے بھی لطیف جسم ہیں، تو اِس لطیف جسم کے اندر یعنی انہوں نے اِس گلوب کو کنٹرول کیا ہوا ہے، اور اِس طرح امام کے ساتھ اِن کا (link) ہے، مرکز ہے، جس طرح کوئی بادشاہی کا نظام ہوتا ہے، ہیڈکوارٹر ہوتا ہے، مرکز ہوتا ہے اس طرح، تو اسی طرح حدودِ دین ہیں، اور اب جو اِس سوال کا جو اصلی حصہ ہے وہ یعنی پتھر کے بارہ چشمے ہیں تو مطلب یہ ہے کہ لاٹھی سے مراد اسمِ اعظم ہے، لاٹھی سے مراد ذکر ہے، ذکر کے ذریعے سے جو رُوحانیت ہے اُس کی ترقّی ہوتی ہے، تو موسیٰؑ نے اپنی رُوحانیت کی لاٹھی سے یا اسمِ اعظم کی لاٹھی سے جو ہے یعنی مرتبۂ اساس جو پتھر ہے اُس سے بارہ چشمے جاری کئے تھے، یہ عالمِ ظاہر کی بات ہوئی اور عالمِ علوی میں جو وہ پتھر ہے وہ گوہرِ عقل ہے، تو تاویل کے مختلف مقامات ہوتے ہیں، اور ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہوں کہ تاویل جو ہے وہ بدلتی رہتی ہے۔

کبھی قرآن سے مراد اساس ہوگا، اور کبھی قرآن سے مراد قرآن بھی ہوسکتا ہے اور کبھی قرآن سے مراد پیغمبر بھی ہوسکتے ہیں، کبھی قرآن سے مرد الوحِ محفوظ بھی ہوسکتی ہے، کبھی قرآن سے مراد عقلِ کُلی بھی ہوسکتا ہے، وغیرہ۔ اسی طرح تاویلات جو ہیں وہ (change) ہوتی جاتی ہیں، اور اِس کے لیے ایک اصول ہے، میں کبھی اس پہ یعنی گفتگو کروں گا، وہ اُصول یہ ہے کہ: "مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا" (۲:۱۰۶) ہم کسی آیت کو از سرِنو نہیں لے آتے

ہیں جب بھی لے آتے ہیں تو اُس سے ایک بہتر آیت سے اُس کو تبدیل کرتے ہیں یا اُس جیسی آیت کو لاتے ہیں، جب ہم کسی آیت کو فراموش کر دیتے ہیں، بھلا دیتے ہیں یا منسوخ کرتے ہیں، تو اِس منسوخ کرنے اور بھلا دینے کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اُس کی جگہ پر ایک نئی آیت کو، نئے حکم کو لے آتے ہیں یا اُس جیسا حکم لے آتے ہیں یا اُس سے بہتر لے آتے ہیں، تو اِس میں تاویل کی بات ہوتی ہے اور نزولِ قرآن کی بات بھی ہے اور حدیث کا قانون بھی اِس میں آتا ہے کہ حدیثیں بھی بعض منسوخ ہو جاتی ہیں، لیکن منسوخ کا کیا مطلب ہے؟ اور منسوخ کے دو معنی ہیں، کوئی چیز منسوخ ہوئی ہے، سب کے لئے منسوخ ہوئی ہے یا کہ منسوخ کا یہ مطلب ہے، کہ آپ (stage by stage) ایک کو ختم کر کے پھر دوسرے میں، پھر تیسرے میں، پھر چوتھے میں جاتے ہیں، تو آپ کے لئے جتنی جو پیچھے چیزیں ہیں وہ ایک طرح سے منسوخ ہیں، ایک یہ بات بھی ہے، اس میں اہلِ ظاہر بحث کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ کوئی چیز منسوخ نہیں ہے اور منسوخ یہ ہے کہ آگے جانا ہے کوئی کہتا ہے کہ یعنی کچھ چیزیں ہیں ایسی ہیں منسوخ، اِس میں اختلاف ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح ہے ایک طرح سے کہ چیزیں منسوخ نہیں ہوتی ہیں بلکہ جو پیچھے ہیں اُن کے لئے منسوخ نہیں ہیں، جو لوگ آگے جاتے ہیں اُن کے لئے منسوخ ہے۔ مثال کے طور پر کسی یونیورسٹی میں کلاسیں ہوتی ہیں، تو جو نئے آنے والے ہیں اُن کے لئے تو وہ کلاسیں صحیح ہیں اور جن کلاسوں سے آپ آگے گزر چکے ہیں، تو آپ کے لئے وہ پچھلی کلاسیں بے کار ہیں، ایک طرح سے۔ قرآن میں ایک تصور یہ بھی ہے، کہ خداوند فرماتا ہے کہ جو کچھ احکام نازل ہوئے ہیں، جو چیزیں تمہارے سامنے ہیں اُن میں اعلیٰ چیز کو لے لو، احسن کو لے لو، سب سے بہترین چیز کی تلاش کرو، تا کہ اِس سے ارتقاء ہو جائے گا، تا کہ اِس سے بلندی ہو جائے گی، تا کہ اِس سے گوہرِ عقل تک جانے کے لئے راستہ ملے گا، ہر شخص کے لئے جو چیز مفید ہو وہی کرے گا اور جو شخص اُس سے آگے جا چکا ہے تو وہ ایک ایسی چیز کو تلاش کرے جو اُس کو تشفّی و تسلّی ہو، مثال کے طور پر کل ہم نے کسی بات کی وضاحت کی تھی تو آج وہ آپ کو نہیں چاہیئے، کوئی اور چیز چاہیئے، اگر ایک چیز کو سَو مرتبہ دہراتے ہیں تو اِس میں کوئی مزہ نہیں ہے، علم کی نعمتیں اِس طرح بے پناہ ہیں اور یہ علمی ترقّی ہے۔

سوال: (شاہدہ محی الدین) سر! آپ نے فرمایا کہ گوہرِ عقل کے بارہ پہلو ہیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ امام کا علم جو مختلف درجات میں ہے اور جس کو حجتان پھیلاتے ہیں وہ ۲۴ ہیں، ۱۲ شب کے اور ۱۲ روز کے ہیں، گوہرِ عقل کے بارہ پہلو ہیں)

جواب: گوہرِ عقل کے جو ہے گنتی کے لحاظ سے تمام گنتی کا اُس پر اطلاق ہوتا ہے، اُس کے سات پہلو ہیں، اُس کے تین پہلو ہیں، اُس کے بارہ پہلو ہیں، اُس کے چوبیس پہلو ہیں، اُس کے اٹھائیس پہلو ہیں وغیرہ۔ چونکہ وہ مادّی چیز نہیں ہے تو اُس کے ظہورات اور اُس کی تجلیات جو ہیں ہر وقت بدلتے رہتے ہیں، تو اِس لئے ایک لحاظ سے وہ صحیح ہے کہ اُس کے بارہ یعنی پہلو ہیں، جس طرح کہ حضرتِ موسیٰ کے بارہ چشمے ہیں، تو اِس بات میں بارہ حجتوں کا ذکر آتا ہے اور

جہاں بارہ بارہ چوبیس ہیں اور وہ مقرّب حجتوں کے ساتھ اٹھائیس ہیں، تو وہ بات بھی اِس میں آتی ہے بلکہ اِس میں اور بھی اعداد کی تاویل ہے، مثال کے طور پر سات آسمان ہیں، تو جہاں خداوندِ عالم نے فرمایا کہ میں آسمان کو لپیٹوں گا، مطلب اِس کا یہ ہوا کہ اُس لپیٹنے کی کیفیت میں سات آسمان اُس کے اندر آئیں گے، تو اگر صرف ہم سات کو لیتے ہیں یا سات کا تصور کرتے ہیں، تو یہ صحیح ہے کہ گو ہرِ عقل میں سات آسمان بھی ہیں اور جہاں سات بہشتوں کا ذکر کرتے ہیں، تو یہ بھی صحیح ہے کہ اُس میں سات بہشت ہیں اور اسی طرح سے جو (figure) کا تعلق ہے وہ بھی اسی اصول کے مطابق، جس میں ہم نے کہا تھا کہ تاویل جو ہے وہ ہر وقت بدلتی رہتی ہے، تو (figure) کی تاویل بھی بدلتی رہتی ہے۔

روز سے مراد ظاہر اور شب سے مراد باطن، تو ہر روز کے ساتھ ایک شب ہے نا، تو اِس لئے ہر نہاری حجّت کے سامنے ایک لیلی حجّت بھی ہے۔ حجّتِ شب اور حجّتِ روز کے متعلق اب یہ جاننا ہے کہ شب سے باطن مراد ہے، اور اگر شب سے باطن مراد ہے اور روز سے ظاہر مراد ہے، تو جہاں تک درجے کا تعلق ہے وہ ظاہر میں درجوں کا تعین ہو جاتا ہے۔ جب ہم باطن کے باطن میں جاتے ہیں، تو سب چیز ایک ہی ہو جاتی ہے اور ہر چیز کی اہمیت ہو جاتی ہے، جس طرح دن کی اہمیت ہے تو رات کی بھی اہمیت ہے، اور رات نہ ہو تو پھر دن کیسے ہو سکتا ہے، اِس لئے ظاہر کی نسبت باطن کی افادیت کو دیکھیں تو صحیح ہے لیکن ایک مقام پر جانے کے بعد تمام چیزیں ایک ہو کر مل کر سامنے آتی ہیں۔ میرے خیال میں اِس اعتبار سے حجتانِ شب جو ہیں وہ زیادہ بھید والے ہو سکتے ہیں، لیکن ایک شخص کے لئے جو یعنی جاتا ہے اور اُس کا مقام صرف ظاہر ہے تو اُس کے لئے ظاہری طور پر جن حجتوں سے اُس کو فیض ملتا ہے اُن کی عظمت و اہمیت ضروری ہے اُس کے نزدیک لیکن جب وہ اُس سے آگے بڑھ کے باطن میں جاتا ہے تو اُس وقت شاید حجتانِ شب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، چونکہ اُس مقام پر تو بہت سے پوشیدہ بھید ملتے ہیں۔

جس طرح ہم عام طور پر کہتے ہیں کہ ظاہر پر باطن کی فضیلت، یعنی بذاتِ خود درجات ہیں پھیلے ہوئے لیکن ہر کسی کو اِن درجات سے گزرنا بھی ہے، جیسے قصۂ یوسف میں آتا ہے، کہ جس زمانے میں اُس نے خواب دیکھا تھا اُس زمانے میں اُس کا درجہ حجتوں میں سے ایک تھا، وہ امام نہیں تھا، باب بھی نہیں تھا، وہ بارہ حجتوں میں داخل تھا لیکن چونکہ وہ امام کا فرزند تھا تو اُس نے آہستہ آہستہ اُن کو کراس کیا اور اتنا کراس کیا کہ وہ نہ صرف گیارہ حجتوں سے آگے بڑھا بلکہ باب سے بھی آگے گیا اور پھر امام نے بھی اُس کو اپنا نور دے دیا۔ مثال کے طور پر ایک مومن کو چاند کی طرح بارہ برجوں میں سے گھومنا ہوتا ہے، بارہ برج ہیں اور اُن کے اندر اٹھائیس منازل ہیں، جس طرح بارہ حجّت ہیں لیکن کُل ملا کر اُس میں اٹھائیس ہیں، منازلِ قمر کہتے ہیں، چاند کی منزلیں۔ یہ آپ کو علمِ نجوم یا یعنی حیات یا کچھ آسمانی علم کی کتابوں میں [ملے گا]، تو اسی طرح یوسفؑ تو عملاً امام ہو گئے، آپ تو امام نہیں ہو سکتے ہیں لیکن معرفت کو حاصل کر سکتے ہیں، معرفت کو حاصل کرنے کے لئے

(demonstration) کرنا ہوگا، آپ کو اپنی ہستی کے اندر اِن بارہ حجتوں سے، بلکہ چوبیس سے بلکہ اٹھائیس سے آگے بڑھنا ہوگا۔ رُوحانی طور پر اور تاویلی طور پر مومن جو ہے وہ چاند ہے، چاند اور یہ جو بارہ حجّت ہیں اِس کے برج ہیں، جو اٹھائیس ہیں وہ منزلیں ہیں، تو چاند تو کامل ہوتا ہے نا، چاند کبھی گھٹتا ہے، کبھی بڑھتا ہے نا، تو اس طرح رُوح کے اندر یہ گھٹنا، بڑھنا یہ گزارا ہوتا رہتا ہے، تو چاند کو کامل ہونے کے لئے ظلمت و نورانی کے تمام ۳۶۰ ڈگری سے گزرنا ہوگا، تو اِس کو اگر یعنی (circle) میں لیا جائے تو ۳۶۰ ڈگری ہوتے ہیں، جو ۳۶۰ داعی ہیں اور ۳۶۰ داعی ہیں اور بارہ یعنی بروج ہیں جو بارہ حجّت ہیں اور اٹھائیس منزلیں ہیں جو اٹھائیس حجّت ہیں ایک لحاظ سے، تو دین کا (circle) پورا کر کے اِس ڈائل میں سے گزر کے معرفت کو مکمل کرنی ہوتی ہے تو تب یعنی چاند کامل ہوگیا، رُوح کا چاند۔

میرا کہنا یہ ہے کہ اگر خدا تمام علم کے تجزیے کو فرض کرتا تو گویا کہ اُس کے پانے کا راستہ بہت مشکل ہو جاتا، لہٰذا اُس نے یعنی ایسا کیا کہ پانی کی سطح پر جہاز، چلے منزلِ مقصود کو پہنچے، منزلِ مقصود کو پہنچنے کے بعد وہاں سے جو نور حاصل ہوگا اُس نور کو لے کے، کہ ہر چیز پر روشنی ڈالی جائے نورِ معرفت سے اور علم کا تجزیہ کیا جائے تو ٹھیک ہے آرام سے، اور پھر تجزیہ اتنا فرض نہیں ہے۔ مثال آپ کو امام ملا ہے جیسا کہ ملنا چاہئے، رُوحانیت کی منزلیں ہوگئیں ہیں، پھر اِس جسم کے اندر چونکہ یعنی اِس دنیا کے اندر علم کے لئے وہ ذرائع محکم ہیں، لہٰذا وہ علم جو جنّت میں مل سکتا ہے یہاں نہیں ملے گا، چونکہ ہمارا جو ذہن ہے وہ مادّی قسم کا ہے اور دنیا کی بہت ساری مجبوریوں میں ہے، پھر ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ جب ہم لطیف زندگی میں بہشت کے اندر ہوں گے، تو اُس وقت علم کے روشن امکانات ہوں گے اور ہم ہر چیز پر روشنی ڈال سکتے ہیں اور اُس مقام پر ہم کو جو تائید آئے گی وہ (full-fledged) تائید آئے گی، عقل کی اور نفس کُل کی تائید اور اُس وقت ہمارے لئے کوئی چیز رکاوٹ، باعثِ رکاوٹ نہیں ہوگی، تو مطلب یعنی وہاں جو علم ہوگا بہت روشن علم ہوگا۔

دینِ فطرت میں ایک قانون ہے کہ آدم نے خلیفۂ خدا ہونے کی حیثیت سے فرشتوں کو درس دیا اور خدا یہ فرماتا ہے کہ تم کو بھی خلافت ملنے والی ہے، تو اِس کا اشارہ یہ ہے کہ تم بھی آدم کی طرح فرشتوں کو درس و تعلیم دو گے، یہ اشارہ ہے۔ چونکہ قرآن کی حکمتیں اشاروں میں ہوتی ہیں۔ علم لینے میں یا علم دینے میں اور رُوحانی سلطنت جس کو ہم باور کرتے ہیں وہ یہ کہ علم کے لینے میں اور دینے میں ہے، یہ دورِ قیامت ہے اور اِس میں اِکّا دُکّا ایسے کام کا ہونا ضروری ہے تاکہ یہ بھی ایک حجّت ہو لوگوں پر خدا کی طرف سے کہ انہوں نے اِس زمانے میں رُوح کی طرف توجّہ نہیں دی حالانکہ امکانیت تھی، تاکہ قیامت کے دن یہ شہادت ہو وغیرہ، تو یہ اِس دور کے عجائبات میں سے ہیں، لطیف جسم اور رُوحِ حیوانی تک پہنچ جاتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ، کیونکہ انہوں نے رُوح کو تو نہیں پہچانا، لہٰذا سب سے پہلے جو چیز اُن کو ملے گی اُس کو رُوح تسلیم کریں گے، پھر اُس کے بعد اُس کی اور ترقّی ہوگی، اُس کے ساتھ یہ بھی ہے۔

سوال: کیا وہ فرشتوں کو تعلیم دیتا ہے یا رُوحوں کو تعلیم دیتا ہے؟
جواب: رُوحوں کو تعلیم دیتا ہے۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: نجمہ بیگ نظرِ ثانی: اکبر علی پرُوف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیر ہونزائی ق س کا پرحکمت بیان

سورۃ الصّٰٓفّٰت

کیسٹ نمبر ۲۷۔ تاریخ ۲۴ مئی ۱۹۸۴ء

Click here for Audio

۔۔۔کے قصّے سے کچھ آگے بڑھے تھے، لیکن آج ہم پھر حضرت ابراہیمؑ ۔۔۔ اور یہ سورۂ صٰفّٰت ہے، جو ۳۷ نمبر کا سورہ ہے اور آیت (نمبر) ۸۳ ہے، اور اس کا ربط حضرت نوح علیہ السّلام کے قصّے سے ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○ وَاِنَّ مِنۡ شِيۡعَتِهٖ لَاِبۡرٰهِيۡمَ (۳۷:۸۳) "اور تحقیق نوحؑ کے تابعوں میں سے ابراہیمؑ تھا" اس آیہ کریمہ کی حکمت یہ ہے کہ سلسلۂ انبیاء علیہم السّلام کبھی منقطع نہیں ہوا ہے، اس لئے انبیاء علیہم السّلام کا نمایاں ذکر حضرت نوح علیہ السّلام سے شروع ہوجاتا ہے، چنانچہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو حضرت نوحؑ سے ملا دیا جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ آنحضرت کا سلسلہ حضرت ابراہیمؑ سے جا ملتا ہے، یعنی نبوت اور امامت کا سلسلہ، اس سے ظاہر ہے کہ جو خدا کی رسی ہے اور جو خدا کا نور ہے، وہ انبیاء و ائمہ علیہم السّلام کی شخصیتوں پر مبنی ہے اور اس کا سلسلہ کسی انقطاع کے بغیر جاری وساری ہے، اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: اِذۡ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلۡبٍ سَلِيۡمٍ (۳۷:۸۴) "جب ابراہیمؑ اپنے پروردگار کے حضور ایک تابعدار دل کے ساتھ آیا" یہاں پر دل کی تعریف کی گئی ہے کہ انسان کامل کا دل کیسا ہوتا ہے، وہ بڑا تابعدار ہوتا ہے اور متوجہ رہتا ہے، اور دل سے روح مراد ہے، اِذۡ قَالَ لِاَبِيۡهِ وَقَوۡمِهٖ مَاذَا تَعۡبُدُوۡنَ (۳۷:۸۵) ارشاد ہے کہ "ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟" یعنی ظاہری تفسیر کے مطابق ان کا والد بت تراش تھا اور ان کی قوم بت پرستی میں مبتلا تھی، اَئِفۡكًا اٰلِهَةً دُوۡنَ اللّٰهِ تُرِيۡدُوۡنَ (۳۷:۸۶) "پوچھا کہ آیا تم جھوٹ موٹ کے معبودوں کو اللہ کے سوا چاہتے ہو؟" اس مقام پر یہ بتانا ضروری ہے کہ بت پرستی کئی طرح کی ہوا کرتی ہے، اس میں دو قسم کی بت پرستی کا ذکر ضروری ہے، ایک ظاہری اور ایک باطنی، ظاہری قسم کی بت پرستی کو سب جانتے ہیں اور اس سے بچنا بھی بڑا آسان ہے، مگر مشکل چیز باطنی بت پرستی ہے، کیونکہ بہت سی صورتوں میں شعوری طور پر بھی اور غیر شعور طور پر بھی باطن میں بت پرستی ہوتی

رہتی ہے، اور ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام بڑا جامع ہوا کرتا ہے، اس لئے جہاں بت پرستی کا ذکر آتا ہے اور اس کی مذمت کی جاتی ہے، سو اس کا اطلاق ظاہری بت پرستی کے علاوہ باطنی بت پرستی پر بھی ہوتا ہے، کیونکہ خداوند عالم کا کلام تمام ہدایت کی ضرورتوں پر محیط ہوا کرتا ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ ابراہیم علیہ السّلام کی قوم ظاہری بت پرستی سے بڑھ کر باطنی بت پرستی میں مبتلا تھی اور خاص کر عالَم دین کی جو روحانی ترقی ہے، وہ بتدریج ہوا کرتی ہے، یعنی عالَم دین کی مجموعی روحانیت درجات پر مرتب ہے اس لئے زمانۂ ابراہیمی تک یعنی آپؑ سے پہلے جو روحانی ترقی ہوئی تھی، وہ کافی نہیں تھی، چنانچہ خداوند عالم کے عظیم الشّان پروگرام کے مطابق جناب ابراہیم صلوات اللہ علیہ کے زمانے میں روحانیت کا ایک انقلاب آنا تھا، لہٰذا بنظر ظاہر حضرت ابراہیمؑ نے اگلی روحانیت پر طنز کیا، کیونکہ اگلی روحانیت بحیثیت مجموعی صرف اتنی تھی کہ اس میں صرف خاموش تصویروں کا مشاہدہ ہوسکتا تھا، وہ تصویریں نہ تو بولتی تھیں اور نہ کچھ ان سے علم کے مسائل حل ہوجاتے تھے، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ نے بحکم خدا وہاں پر ایک انقلاب لانا شروع کیا، فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۳۷:۸۷) پوچھا کہ اے لوگو! جو عالموں کا پروردگار ہے اس کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟ تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا ایک تصویر جو تمہارے اندر بیٹھی ہے، وہ ربّ العالمین ہوسکتی ہے؟ یعنی کہا کہ تمہاری یہ روحانیت کافی نہیں ہے، فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ (۳۷:۸۸) سو انہوں نے اپنے روحانی مشاہدے میں ستاروں کی طرف دیکھا، فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ (۳۷:۸۹) کہا کہ یہ بیمار کی مثال ہے کہ میں زمین پر ہوں، اور صرف ستاروں کو دیکھ سکتا ہوں، مجھے آسمانِ روحانیت پر جانا ہے، لہٰذا اس صورتِ حال سے ظاہر ہے کہ میں بیمار ہوں، انہوں نے اپنے آپ پر بھی طنز کیا، چونکہ انسان کامل اپنی قوم سے وابستہ ہوتا ہے، اور وہ اپنی قوم کی اصلاح کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ سکتا ہے، کیونکہ اس کی قوم کے افراد اس کے اجزاء ہوا کرتے ہیں، جس طرح ہمارے عزیزوں نے نفس کلّی کے متعلق سوالات کئے تھے، ان سوالات کے سلسلے میں عرض کی گئی تھی کہ جب تک نفس کلّی کے اجزاء یعنی نفوس جزوی کی شایانِ شان ترقی نہیں ہوتی ہے، تب تک نفس کلّی کا جو سب سے بڑا مقصد ہے، وہ پورا نہیں ہوسکتا، چنانچہ یہاں بھی یہی حال ہے کہ ابراہیمؑ یہ جانتے تھے کہ قوم کی اصلاح کس طرح کرنی ہے۔

فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ (۳۷:۹۰) غرض وہ لوگ ان کو چھوڑ کے چلے گئے، فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ (۳۷:۹۱) تو یہ ان کے بتوں میں جا گھسے اور کہنے لگے، کہ کیا تم کھاتے نہیں ہو؟ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ

(۹۲:۳۷) تم کو کیا ہوا تم تو بولتے بھی نہیں ہو؟ یہ ایک حکمت ہے، کہ یہ گفتگو زبان حال سے ان تصویروں کے ساتھ ہوتی تھی، فَرَاغَ عَلَيۡهِمۡ ضَرۡبًا بِالۡيَمِيۡنِ (۹۳:۳۷) "پھر ان پر داہنے ہاتھ سے ضرب لگایا" دیکھیں کہ کوئی بھی تاویل ہوتی ہے تو اس کی ایک نشانی یا علامت پائی جاتی ہے، عام طور سے دیکھا جائے تو یہاں دائیں ہاتھ کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ لوگ اکثر دائیں ہاتھ سے کام کرتے ہیں، لیکن یہ نشاندہی ہے کہ روحانیت اور ذکر حضرت ابراہیمؑ کی داہنی طرف تھی اور جب روحانیت بائیں جانب ہوتی ہے، تو اس میں کوئی ایسی اصلاح کی بات نہیں ہوتی ہے، اور یہ اشارہ کیلئے ہے اور بتانے کیلئے ہے کہ ابراہیمؑ نے جو بت شکنی شروع کی وہ اس قوت سے کی جو ان کے داہنے جانب تھی، یعنی اسم اعظم ان کے دائیں کان میں کام کرتا تھا، فَاَقۡبَلُوۡۤا اِلَيۡهِ يَزِفُّوۡنَ (۹۴:۳۷) سو وہ لوگ ان کے پاس دوڑتے ہوئے آئے، قَالَ اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ (۹۵:۳۷) حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے ان سے سوال کیا اور "کہا کہ کیا تم لوگ اس چیز کی عبادت کرتے ہو، جسے تم خود ہی تراش کے بناتے ہو؟ "یعنی انسان جو اپنی کوشش سے، ریاضت سے اپنے تصور کو بناتا ہے اور جو اس کی کوشش کے نتیجے میں جو تصویر بنتی ہے، وہ حقیقی خدا نہیں ہوسکتی ہے، خدا کا درجہ اس سے بلند ہے، وَاللّٰهُ خَلَقَكُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ (۹۶:۳۷) حالانکہ خدا نے تم کو پیدا کیا اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کے ذرائع کو بھی پیدا کیا، اشارہ یہ ہے کہ دیدار خداوندی ایک ایسے مقام پر ہوتا ہے، جہاں پر غیر معمولی چیزیں سامنے آتی ہیں، اور اس میں انسان کی کوشش کا دخل نہیں ہوتا ہے، جس طرح شروع میں ہوتا ہے۔

مثلاً مبدِع اور مبدَع کا ظہور، مثلاً وہ معجزات جو مقام انبعاث پر سامنے آتے ہیں، اس میں انسانی کوشش کا دخل نہیں ہوتا ہے، جب قیامت برپا ہوجاتی ہے اور جبرائیلؑ، میکائیلؑ، اسرافیلؑ اور عزرائیلؑ کام کرتے ہیں تو اس وقت مومن مرجاتا ہے، جب وہ مرجاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ کچھ نہیں کرسکتا ہے، مرگیا، اس مقام سے آگے کوئی اور طاقت کام کرتی ہے، جس طرح ظاہر میں آدمی جب مرتا ہے تو اس کے اختیار کا خاتمہ ہوجاتا ہے، اس کا حساب کتاب ہوتا ہے اور اس کے سامنے جزا وسزا کا وقت آتا ہے، اور اس کی مہلت بھی ختم ہوجاتی ہے، اس طرح اگر کوئی مومن کامیابی سے اس مقام کو پہنچتا ہے تو اس صورت میں بھی اس کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ اس کے بعد وہ کوئی چیز بنائے، خدا کا دیدار اس کے بعد ہوگا اور جو کچھ واقعہ سامنے آئے گا، جو کچھ معجزہ ہوگا، اس میں ایک طرح سے اس کے عمل کا دخل نہیں ہوگا، ہاں وہ اجر وصلہ کے طور پر ہوگا۔

تو اس معنیٰ میں حضرت ابراہیمؑ اپنی قوم کی اصلاح کرتے تھے، اور چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام موحدِ اعظم تھے، اور یہ بات یا یہ حکمت بڑی عجیب ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم جو خاتم الانبیاء اور سردارِ رُسل کا درجہ رکھتے ہیں، ان کی بہت ساری خوبیوں کی آئینہ داری دیگر حضرات انبیاء کیا کرتے ہیں، میرے یوں کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کو موحدِ اعظم کیوں نہیں کہنا چاہئے؟ اور قرآن نے یہ کیوں کہا کہ آپ ابراہیمؑ کی ملّت کی پیروی کیجئے؟ یہ کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ خداوند عالم آنحضرتؐ کو ایک طرح سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے اور دوسرے انبیائے کرام کو آپؐ کیلئے حجاب بنانا چاہتا ہے، یا یوں کہا جائے کہ دیگر حضرات انبیاء آنحضرتؐ کی خوبیوں کی آئینہ داری کیا کرتے ہیں، تو قرآن مقدس میں حضرت ابراہیمؑ توحید کا باب ہیں،[1] یعنی unity of God کا chapter ہیں، لہٰذا حضرت ابراہیمؑ نے روحانی طور پر اپنی قوم کی اصلاح کی اور انہوں نے اپنے والد پر بھی اس سلسلے میں طنز کیا، قَالُوا ابۡنُوۡا لَهٗ بُنۡيَانًا فَاَلۡقُوۡهُ فِى الۡجَحِيۡمِ (۹۷:۳۷) اس کی قوم کے لوگوں نے کہا کہ اب ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کیلئے ایک بڑی سی آگ تیار کرو، فَاَرَادُوۡا بِهٖ كَيۡدًا فَجَعَلۡنٰهُمُ الۡاَسۡفَلِيۡنَ (۹۸:۳۷) "سو ان لوگوں نے ابراہیمؑ کے ساتھ ایک مکر کرنا چاہا، لیکن ہم نے انہیں کو نیچا دکھایا" یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان لوگوں نے ظاہری اور مادی طور پر ایک بہت بڑی آگ جلائی تھی؟ یا اس میں کوئی اور بات ہے؟ اس میں جواباً عرض ہے کہ یہ آگ دراصل روحانی نوعیت کی تھی اور یہ آگ حضرت ابراہیمؑ کے مخالفین کی مخالفتوں اور دشمنیوں سے تیار ہوئی تھی، یعنی روحانی قسم کی آگ تھی، جس کو خدائے قادر نے روحانیت کے باغ و گلشن سے تبدیل کیا۔

وَقَالَ اِنِّىۡ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىۡ سَيَهۡدِيۡنِ (۹۹:۳۷) "اور ابراہیمؑ نے کہا کہ بیشک میں اپنے پروردگار کی طرف جانے والا ہوں، وہ میری ہدایت کرے گا" اس ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے آگے بہت سے مراحل باقی تھے، جن کی مسافتوں کو طے کرنے کیلئے انہوں نے عزمِ مصمم کرلیا، اس مقام پر یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ہدایت کا مطلب کیا ہے؟ اور مذہب کے کیا معنی ہیں؟

مذہب ایک عربی لفظ ہے، تاہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہب وہ چیز ہے جسے عربی میں کہنا چاہئے کہ مَا يُذۡهَبُ عَلَيۡه ، وہ چیز جس پر چلا جاتا ہے، تو مذہب رستے کے معنی میں ہے، جس طرح مسلک راستے کے معنی میں ہے، مقصد یہ ہے کہ مذہب آگے بڑھنے کے معنی میں ہے، جس طرح مسلک آگے بڑھنے کے معنی میں

---

[1] (سورہ: آیت) ۱۳۵:۲، ۶۷:۳، ۹۵:۳، ۱۶۱:۶، ۳۸:۱۲، ۱۲۰:۱۶، ۱۲۳:۱۶۔

ہے، جس طرح اسماعیلی تصور ہے، اور جہاں کہیں قرآن مقدّس میں لفظ ہدایت آتا ہے، اس میں بھی یہ فلسفہ موجود ہے، یعنی درجہ بدرجہ آگے بڑھنے کیلئے ہے، کیونکہ لفظ ہدایت لوگوں کیلئے ایک مسئلہ ہے کہ ہدایت کے کیا معنی ہیں؟ آیا ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص صرف اور صرف صراط مستقیم کو پائے؟ یا ہدایت صراط مستقیم پر آگے بڑھنے کے معنی رکھتا ہے؟ کیونکہ قرآن کے جو ترجمہ کرنے والے ہیں، ان میں اختلاف ہے، اور اس لئے کہ بعض حضرات اِهۡدِنَا سے، یعنی اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ (۱:۶) کا مطلب "ہم کو راہِ راست دکھا" اتنا ترجمہ کرتے ہیں، اس کے برعکس کچھ دوسرے مترجمین "ہم کو راہ راست پر چلا" یہ ترجمہ کرتے ہیں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اس میں فرق ہے، "ہم کو راہِ راست دکھا" اس میں یہ معلوم نہیں کہ کسی کو راہ راست دکھایا جائے تو وہ اسی جگہ پر رک جائے گا؟ یا آگے چلے گا؟ اور اس کے برعکس جب یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ " ہم کو راہ راست پر چلا" تو اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس میں چلنے کے معنی ہیں، اور اسی سلسلے میں ہم ایک مختصر سی آیت کو لیتے ہیں، جو بڑی پرحکمت ہے، يَهۡدِيۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ،[1] خدا راہِ راست کی ہدایت کرتا ہے، ہدایت کرتا ہے تو یہاں فعل کو ختم کرنا مقصود ہے، یعنی راستہ آخر تک دکھاتا ہے، اور اس کا مفہوم ہے کہ منزل مقصود تک کسی کو پہنچا دیتا ہے، اس مطلب کو سمجھے بغیر ہم قرآن کی حکمت تک رسائی نہیں کرسکتے ہیں، تو جب قرآن کہتا ہے کہ يَهۡدِى اللّٰهُ لِنُوۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ (۲۴:۳۵) ایسا نہیں کہ کسی شخص کو نور کی طرف لاتے لاتے کسی منزل میں اور کسی مقام پر روک لیتا ہے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ خداوند عالم جس کو چاہتا ہے، اپنے نور تک پہنچا دیتا ہے، تو يَهۡدِى میں منزل مقصود تک پہنچا دینے اور پہنچنے کے معنی ہیں۔

وَقَالَ اِنِّىۡ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّىۡ سَيَهۡدِيۡنِ (۳۷:۹۹) میں اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں، وہ مجھے منزل مقصود تک پہنچا دے گا، رَبِّ هَبۡ لِىۡ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ (۳۷:۱۰۰) ابراہیم علیہ السّلام نے دعا کی کہ خداوندا! مجھے ایک صالح اولاد عطا کردے، یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا انبیاء علیہم السّلام جسمانی فائدوں کے معنی میں اولاد کو طلب کرتے ہیں؟ ایسا نہیں، وہ دینی مفاد کی خاطر اولاد کو طلب کرتے ہیں، اور دوسری بات جو بہت عمدہ ہے یہ کہ کسی پیغمبرؑ اور کسی امامؑ کی اولاد سے اس کا نور مراد ہے، اور ربط بھی یوں ہے، جیسے ابراہیمؑ نے کہا کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جارہا ہوں، وہ میری ہدایت کرے گا، یعنی وہ مجھے منزل مقصود تک پہنچا دے گا، اور اس کے بعد ایک صالح اولاد کیلئے دعا کا مطلب یہ ہے کہ وہ نورِ کامل کیلئے درخواست کرتے ہیں، اور

---

[1]۔ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ (۲:۱۴۲، ۲:۲۱۳، ۲۴:۴۶)

نور کی مختلف نسبتیں ہوا کرتی ہیں یعنی مختلف رشتے ہوا کرتے ہیں، چونکہ نور حقیقت حقائق ہے، حقیقتوں کی حقیقت ہے، لہٰذا اس کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں، ان پہلوؤں میں سے ایک پہلو، یا کہ ان مختلف رشتوں میں سے ایک رشتہ بیٹے کا ہوتا ہے، وہ نور پیغمبرؑ کا اور امامؑ کا بیٹا کہلاتا ہے، یہی نہیں وہ باپ بھی کہلاتا ہے اور بہت کچھ، تو پورے قرآن میں جہاں کہیں پیغمبروں نے اولاد کیلئے دعا کی ہے، تو یہ نورانی اولاد ہے، اس سے نور ہے، جیسے ایک پیغمبر (حضرت زکریاؑ) نے دعا کی رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّ اَنۡتَ خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ (۸۹:۲۱) اے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ دے، حالانکہ تو بہترین وارثوں میں سے ہے، بہترین وارثوں میں سے ہے میں دو مطلب ہیں، ایک مطلب اس میں یہ ہے کہ اس نور میں خدا خود ہے، خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ، یہ صفت خدا کو جا رہی ہے، اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ خدا سے عرض کی جاتی ہے کہ تو میرے لئے ایک وارث کو پیدا کر، مجھے ایک وارث عطا کرتا کہ دین کے معاملے میں میرا وارث قرار پائے، اس سے ظاہر ہے کہ حضرات انبیاء و ائمہ علیہم السّلام دنیا کی غرض سے اولاد کو طلب نہیں کرتے ہیں، بلکہ دین کیلئے طلب کرتے ہیں، دین کیلئے طلب کرتے ہیں تو ان کا جو جانشین ہوتا ہے وہ نور ہوتا ہے، یعنی جو ان کا جانشین بننے والا ہے، اس کا ظہور سب سے پہلے اُن کے نور میں ہوتا ہے، اس سلسلے میں تسلّی کیلئے جب ہم قصۂ مریم کو لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے جسمانی وجود بننے سے قبل ان کا نورانی وجود بن گیا تھا، جو اسم اعظم کی صورت میں بی بی مریم علیہا السّلام میں منتقل ہوگئے تھے اور یہی اصول تمام انبیاء و ائمہ کیلئے مقرر ہے، فَبَشَّرۡنٰہُ بِغُلٰمٍ حَلِیۡمٍ (۱۰۱:۳۷) سو ہم نے ان کو بشارت دی ایک تحمل والے لڑکے کی، اس سے حضرت اسماعیل علیہ السّلام مراد ہیں، تو حضرت اسماعیل علیہ السّلام کے جسمانی وجود سے قبل نورانی وجود بن گیا، فَلَمَّا بَلَغَ مَعَہُ السَّعۡیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُکَ فَانۡظُرۡ مَاذَا تَرٰی ط قَالَ یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ ز سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ (۱۰۲:۳۷) جب حضرت اسماعیل اپنے والد بزرگوار کے ساتھ روحانیت کے مراحل میں سے اس مرحلے کو پہنچا، جہاں پر بڑی تیزی کے ساتھ کام ہوتا ہے، تو اس وقت ان کے والد نے کہا کہ اے میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تم کو ذبح کرتا ہوں، تو دیکھ لیجیے اس میں آپ کی رائے کیا ہے؟ اسماعیل کہنے لگے کہ اے میرے والد! جو کچھ آپ کو حکم ہوا ہے، اس پر عمل کیجئے، ان شاء اللہ آپ مجھے صابروں میں سے، صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے، اس کا ظاہری مطلب کچھ یوں ہے کہ جب حضرت اسماعیلؑ چلنے پھرنے اور دوڑنے کے قابل ہوگئے تو تب ان کے والد نے ان کو یہ بات کہی، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فَلَمَّا

بَلَغَ مَعَهُ السَّعۡىَ (۱۰۲:۳۷) تو کیا یہ ضروری ہے کہ ہر وقت باپ کے ساتھ بیٹا چلتا، پھرتا اور دوڑتا تھا؟ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعۡىَ (۱۰۲:۳۷) مَعَهُ السَّعۡىَ کا مطلب ہے، اس میں نور کا ذکر ہے کہ نور اور شخصیت کی روحانی ترقی ایک ساتھ ہوتی ہے، نور تو بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے اور شخصیت کے مراحل روحانی طے ہوتے جاتے ہیں، اور قرآن کے کئی مقامات پر نور سے متعلق "سعی" دوڑنے اور تیزی سے آگے بڑھنے کا ذکر ہوا ہے، یہ اس لئے کہ جو سفر ہے وہ پچاس ہزار برس کا ہے، اور اگر ان مسافتوں کو بڑی تیزی کے ساتھ طے نہ کرلی جائیں تو انسان کی عمر اس کیلئے کافی نہیں ہے، اس لئے نور کا قانون یہ ہے کہ وہ بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے، اس لئے قرآن نے نور کی حرکت کے لئے لفظ "سعی" کو استعمال کیا ہے، اور اس آیت کا جیسا ظاہری ترجمہ ہے وہ آپ سے مخفی نہیں ہے، میں اکثر ترجمے کے مطلب کو چھوڑتا ہوں۔

---۔ بتا دینی چاہیئے، وہ یہ کہ کامل انسانوں کی نیند روحانیت ہوتی ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ ابراہیمؑ نے کہا کہ میں نے یہ چیز خواب میں دیکھی ہے۔

(۲۷ بی)

اس کے جواب میں اسماعیلؑ نے کہا کہ آپ جو حکم ہوتا ہے، جو امر ہوتا ہے، اس پر عمل کیجئے، تو ابراہیمؑ کے خواب کو اسماعیلؑ نے امر الٰہی قرار دیا، یعنی وحی کا درجہ دیا، اس کے یہ معنی ہوئے کہ انبیاء و ائمہؑ کا خواب روحانیت کا درجہ رکھتا ہے، ویسے بھی ہم نے اس سلسلے میں بحث کی ہے کہ عالم خیال، عالم خواب، عالم روحانیت اور عالم بیداری عام حالت میں الگ الگ ہیں، لیکن ترقی کے بعد یہ چار حالتیں یا چار عوالم ایک ہوجاتے ہیں، مثلاً ایک کامل انسان کی یہ چار کیفیتیں ایک ہیں، کوئی پیغمبر، کوئی امامؑ اس حالت میں ہوتا ہے کہ وہ اس کا خواب، اس کا خیال، اس کی روحانیت (اور) اس کی بیداری ایک ہوگئی ہے، فَلَمَّآ اَسۡلَمَا وَتَلَّهٗ لِلۡجَبِيۡنِ (۱۰۳:۳۷) جب ان دونوں نے اطاعت کی خدا کیلئے اس قربانی کے سلسلے میں اور حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کیلئے کروٹ پر لٹایا، تو وَنَادَيۡنٰهُ اَنۡ يّٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ (۱۰۴:۳۷) اور ہم نے ندا کی، آواز دی کہ اے ابراہیمؑ! قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡيَا (۱۰۵:۳۷) تحقیق تم نے خواب کو سچ کر دکھایا، اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ (۱۰۵:۳۷) تحقیق ہم اسی طرح نیکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں، اس مقام پر خاص بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السّلام نے جو عزم مصمّم کیا تھا اس قربانی کیلئے اور اس ذبح کیلئے تو اس کو خداوند عالم نے شرف قبولیت بخشا، اور پھر اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ (۱۰۵:۳۷) قرآن مقدس میں جہاں

جہاں كَذٰلِكَ کا لفظ آتا ہے، وہ اپنے مربوط آیات کو عام اصول کا درجہ دیتا ہے، یعنی یہاں اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ (۳۷:۱۰۵) کا مطلب یہ ہوا کہ یہ جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے سامنے جو آزمائش تھی، یا یہ جو قربانی کا مسئلہ تھا، یہ کوئی خصوصی بات نہیں تھی، بلکہ یہ کامل انسانوں میں ایک اصول ہے، اور اس کے علاوہ پانچ قسم کے افراد پر یہ حالت گزرتی ہے، انبیاء، صدّیقین، شہداء، صالحین اور تابعین، یعنی ناطق، اساس، امام، حجت اور داعی، ناطق، اساس، امام، حجت اور داعی، یہ اصول یہاں تک پہنچتا ہے، اگر داعی سے حقیقی مومنین مراد لیں تو اس کا تجربہ روحانیت میں ذبح کرنے کا یا ذبح ہوجانے کا جو تجربہ ہے، تو یہ حقیقی مومنین تک پہنچتا ہے، کیونکہ تابعین میں حقیقی مومنین تقریباً سب آجاتے ہیں، اور یاد رکھیے گا کہ قرآن میں جہاں کہیں كَذٰلِكَ ہے تو آپ اس مقام پر ٹھہریئے کہ وہاں پر کوئی ایسا اصول مذکور ہے، کہ جس کا اطلاق عام ہے اور ہمیشہ ہے، اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ (۳۷:۱۰۵) یعنی جس طرح ہم نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کو قربانی کی عظیم عبادت کا صلہ دیا، اسی طرح ہم دوسرے تمام محسنین کو بھی یہ درجہ دے سکتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے، اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡبَلٰٓؤُا الۡمُبِیۡنُ (۳۷:۱۰۶) تحقیق یہ بات وہی ہے آزمائش کی ظاہر میں، وَفَدَیۡنٰهُ بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ (۳۷:۱۰۷) اور ہم نے ابراہیمؑ سے ایک بڑی قربانی فدا کر دیا، یعنی اسماعیلؑ کی جگہ پر ایک بہت بڑی قربانی رکھی اور اسماعیلؑ کو چھڑایا، یہاں پر ایک بہت بڑا سوال سامنے آتا ہے کہ یہ ذبحِ عظیم کیا تھا؟ جو اسماعیلؑ کے مقابلے میں، اسماعیلؑ کی ظاہری قربانی کے مقابلے میں بڑا ہوسکے؟ اگر مانا جائے کہ وہ ایک بہشت کا دنبہ تھا جو اسماعیلؑ کے بدلے میں ذبح ہوا تو پھر عقل کس طرح باور کرسکتی ہے کہ دنبہ حضرت اسماعیلؑ کی جسمانی اور ظاہری قربانی کے مقابلے میں ذبحِ عظیم کہلا سکے؟ اصل میں ذبحِ عظیم ایک روحانی تجربہ ہے، اور کچھ ذکر ہمارے بزرگانِ دین نے بھی کیا ہے، یہ کہ ذبحِ عظیم یہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ پر حضرت اسحاقؑ کو حجاب بنایا گیا، کہ اسماعیلؑ امام مستقر تھے اور اسحاقؑ امام ستودع، اور ذبحِ عظیم منزل عزرائیل پر پیش آتا ہے کہ وہاں پر جان کو نکالنے کا تجربہ ہوتا ہے، یہ واقعہ ایسا ہے کہ ہر پیغمبر پر اور ہر امام پر گزرتا ہے، اور اس کے علاوہ حصول معرفت کے سلسلے میں جو حضرات آگے بڑھتے ہیں اور جن کو معرفت نصیب ہوجاتی ہے، ان پر بھی تجربے کے طور پر اور پہچان کے پیش نظر ان پر بھی یہ تجربہ گزرتا ہے، تو حضرت اسماعیلؑ کی جسمانی قربانی کے بدلے میں ذبحِ عظیم یہ ہوا کہ ایک تو اسماعیلؑ بجائے اس کے کہ جسمانیت میں ذبح ہوجائے روحانیت میں ذبح ہوگئے، ایک بات، دوسری بات یہ کہ ان کے بھائی اسحاقؑ کو بھی اسی طرح روحانی طور پر ذبح کیا گیا، کہ وہ عزرائیل کے تجربے سے گزرے اور اسی معنیٰ میں ان سے عہد لیا گیا، امام مستقر کا عہد اور امام مستودع کا

عہد ان سے لیا گیا، اور اسماعیلؑ پر اسحاقؑ کو حجاب بنایا گیا، کہ بہت سارے کاموں کو اسحاقؑ انجام دے، اس کے علاوہ ذبح عظیم میں یہ معنی بھی آتے ہیں کہ اگر اسماعیلؑ جسمانی طور پر ذبح ہوجاتے تو یہ ذبح بڑا نہیں تھا، اس کے مقابلے میں کہ جس طرح آپؑ زندہ رہے، اورانہوں نے روحانی طور پرذبح ہونے کی قربانی پیش کی اور پھراس کے علاوہ ان کی نسل سے آنحضرتؐ دنیا میں تشریف لائے، اور سلسلۂ امامت رہتی دنیا تک چلتا رہا، ان تمام معنوں میں حضرت اسماعیلؑ کا (جسمانی طور پر) زندہ رہنا بہت بڑی قربانی تھی، اس سلسلے کی ایک چھوٹی سی مثال، اگر باغبان کسی درخت کو کاٹ کے ایک کرسی بناتا ہے یا میز یا اورکوئی چیز بناتا ہے وہ اس درخت کی بڑی قربانی نہیں ہے، درخت کی بہت بڑی قربانی یہ ہے کہ وہ ہرا بھرا رہے اور اس میں سے پھل ملتا رہے، اور اس درخت سے کئی اور پودے اور درخت پیدا ہوجائیں، یہ اس درخت کی بہت بڑی قربانی ہے، اس سلسلے میں قرآن مقدس کے اندر ایک آیت ملتی ہے، وہ آیت ایسے مومنین کی شان میں ہے جو زندہ ہیں مگر جوشہیدوں کا درجہ رکھتے ہیں،[1] آپ کو شاید یاد ہو کہ حضرت مولانا الامام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے کہیں اپنے ارشادات میں مومنین کے متعلق فرمایا ہے کہ مومن زندہ شہید کی طرح ہے،تو یہ ذبحِ عظیم کی تشریح ہے، وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ (۱۰۸:۳۷) آپ دیکھیں یہ ایک مشکل آیت ہے اور آپ کسی بھی ترجمے کو لیں گے،تو اس سے سوال حل نہیں ہوسکے گا، وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ (۱۰۸:۳۷) اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کی سنت کو آنے والے لوگوں کے درمیان زندہ رکھا، اب اس کے دو پہلو ہیں، کہ ظاہر میں یہ سنت ہے کہ کسی دنبے کو ذبح کیا جائے، باطن میں اس کا پہلو یہ ہے کہ ہر زمانے میں امام ہوتا رہے گا اور اس پر یہ واقعہ گزرتا رہے گا، اوراس کے حدود میں بھی یہ بات ہوتی رہے گی، جس طرح ہمارے بزرگانِ دین کی کتابوں میں اس کو عہد لینا کہا گیا ہے،[2] یعنی ذبح کا ذکر جہاں بھی آیا ہے، شرعی طور پر یعنی گوسفند کو ذبح کرنا، اونٹ کونحر کرنا یا گائے، بیل اور حلال جانوروں کا ذبح کرنا، اس کی تاویل ہمارے بزرگانِ دین نے عہد لینا بتایا ہے، اور میں نے اس کو ذرا اور آشکار کرکے بتایا کہ مرحلۂ عزرائیل پر جان لینے کا جو تجربہ ہوتا ہے، وہ عہد لینا ہوتا ہے، اس کو ذبح کرنا ہوتا ہے، کہ وہ راز کو راز کے طور پر رکھے، اور اس کوکسی مقصد کیلئے، کسی کام کیلئے تیار کیا جاتا ہے، جس طرح گوسفند کو ذبح کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک تو وہ کچھ نہ بولے اور کچھ حرکت نہ کرے، وہ حرکت نہیں کرسکتا ہے، دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جس نے اس کو ذبح کیا ہے وہ اس کو کھا لیتا ہے اور اپنا جزوِ بدن

---

[1]- وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (۱۵۴:۲)

[2]- وجہ دین ص ۲۴۴

بناتا ہے، تو یہ روحانی ذبح ترقی کیلئے ہوتا ہے، وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ (۳۷:۱۰۸) چونکہ یہ جو واقعہ ہے، یہ قرآن کی رو سے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ پر ظاہر ہے، لہٰذا اسی زمانے سے ہم نے اس کو اصول بنایا، یا اس کو روحانی روایت کے طور پر رکھا، تاکہ آنے والے لوگ اس کو کرتے رہیں، اہل ظاہر ظاہری قربانی کرتے رہیں اور اہل باطن باطنی قربانی کرتے رہیں۔

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (۳۷:۱۰۹) اس کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ کوئی بھی حضرت ابراہیمؑ کا نام لے تو علیہ السّلام کہے، اس کے باطنی معنی یہ ہیں کہ ابراہیمؑ نور میں زندہ ہے، ابراہیم پر سلامتی ہے، تو نور میں تمام انبیاء زندہ ہیں، سلام اور سلامتی کے معنی یہ ہیں کہ جس کے متعلق قرآن نے کہا "سلامٌ" اس کے متعلق یہ آگہی ہے کہ وہ ہمیشہ دنیا میں زندہ ہے نور میں، كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ (۳۷:۱۱۰) پھر وہی عام اصول آتا ہے کہ یہ بات صرف ابراہیمؑ کیلئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ محسنین، جس میں سب سے پہلے انبیاء آتے ہیں اور ائمہ آتے ہیں، پھر ان کے حدود اور حقیقی مومنین آتے ہیں، تو ان تمام محسنین کیلئے ہم ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں، اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ (۳۷:۱۱۱) وہ ابراہیمؑ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے، وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۳۷:۱۱۲) اور ہم نے ان کو خوش خبری دی اسحاقؑ کی پیدائش کے بارے میں کہ وہ پیغمبروں میں سے تھے اور صالحین میں سے تھے، وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ (۳۷:۱۱۳) اور ہم نے ان کو برکت دی اور اسحاقؑ کو بھی برکت دی، یعنی ہر طرح سے ان کو برکت دی، عقلی، روحانی اور جسمانی طور پر وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ (۳۷:۱۱۳) اور ان دونوں کی اولاد میں سے محسنین بھی ہیں اور کچھ ایسے لوگ بھی ہیں، جنہوں نے اپنی جان پر ظلم کیا، یہاں پر یہ ذکر ہے کہ کچھ لوگ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں، تو اس کے سامنے احسان کا بھی ذکر ہے تو احسان بھی دو قسم کا ہے، ظلم بھی دو قسم کا ہے، ایک احسان اپنے آپ پر ہے، ایک احسان دوسروں پر ہے، ایک ظلم دوسروں پر ہے، ایک ظلم اپنی ذات پر ہے، تو ظلم کے بھی دو مقام ہیں اور احسان کے بھی دو مقام ہیں، اپنے آپ پر احسان کیا ہے؟ جو اپنی عقل کو، اپنی روح کو ترقی دیتا ہے، یہ اپنے آپ پر احسان ہے اور جو شخص اپنے آپ پر احسان نہیں کرتا ہے تو دوسرے پر کیسے احسان کرسکتا ہے؟ دوسروں پر احسان کرنے کیلئے سب سے پہلے اپنے آپ پر احسان کرنا چاہیئے، جس طرح کوئی شخص دوسروں کو کچھ سکھانا چاہتا ہے، تو ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ خود سیکھے اور جو اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے تو وہ دوسروں کیلئے کیا عدل کرسکتا ہے؟ دیکھیں جو کچھ ہے وہ سب سے پہلے اپنی ذات ہے، مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ

رَبَّهٗ،[1] رب کو پہچاننا بعد میں ہے، اپنی ذات کو پہچاننا پہلے ہے، اس طرح احسان ہے اور عدل ہے، تو سب سے پہلے اپنی روح کیلئے ہونا چاہیئے، وَلَقَدۡ مَنَنَّا عَلٰی مُوۡسٰی وَهٰرُوۡنَ (۳۷:۱۱۴) اور ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا، آپ دیکھتے ہیں کہ موسیٰ اور ہارون کا ایک ساتھ ذکر ہے، وَ نَجَّيۡنٰهُمَا وَقَوۡمَهُمَا مِنَ الۡكَرۡبِ الۡعَظِيۡمِ (۳۷:۱۱۵) ہم نے ان کو نجات دی اور ان کی قوم کو بھی سختی سے نجات دی، اس میں فرعون کے ظلم کی بات ہے اور اس ظلم سے نجات دینے کی بات ہے، وَنَصَرۡنٰهُمۡ فَكَانُوۡا هُمُ الۡغٰلِبِيۡنَ (۳۷:۱۱۶) اور ہم نے ان کی مدد کی، جس کی بدولت وہ غالب ہوگئے، وَاٰتَيۡنٰهُمَا الۡكِتٰبَ الۡمُسۡتَبِيۡنَ (۳۷:۱۱۷) اور ہم نے ان کو بولنے والی کتاب دی، یہاں پر بظاہر تورات ہے اور بباطن ان کی روحانیت و نورانیت ہے، کسی پیغمبر اور امام کی روحانیت و نورانیت بولنے والی کتاب ہوا کرتی ہے، اور تورات ان کی روحانیت و نورانیت سے الگ نہیں تھی۔

وَ هَدَيۡنٰهُمَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ (۳۷:۱۱۸) اور ہم نے صراط مستقیم پر ان کی ہدایت کی، یعنی صراط مستقیم پر ان کو منزل مقصود تک پہنچا دیا، وَتَرَكۡنَا عَلَيۡهِمَا فِى الۡاٰخِرِيۡنَ (۳۷:۱۱۹) اور ان سے جو کچھ کیا گیا تھا روحانی طور پر یہ سنت اور یہ اصول آنے والے لوگوں میں بھی رکھا، اس کا یہ واضح اشارہ ہے کہ جس طرح زمانۂ موسیٰ میں ایک تو تھے پیغمبر اور دوسرے تھے امام، اور یہی اصول اور یہی سنّت ہم نے ہمیشہ کیلئے رکھی، کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ خداوند عالم ایک آیت پر زور دیتا ہے، یہ کہ اس کی عادت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے، اس کا واضح اشارہ یہ ہے کہ جس طرح ہر زمانے میں پیغمبر کے ساتھ امام ہوا کرتا تھا، اس طرح زمانۂ نبوت میں بھی آنحضرتؐ کے ساتھ ساتھ مولا علیؑ کا امام ہونا حقیقت ہے، اور ہمیشہ کیلئے، گوکہ اس زمانے میں نبوت نہیں ہے، لیکن جس طرح نبوت کا تصور ہے، اسی طرح امامت کا تصور لازمی ہے، اور یہی وجہ تھی کہ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مولا علیؑ کی تشبیہہ کسی اور شخصیت سے نہیں دی، بلکہ ہارونؑ کی شخصیت سے تشبیہہ دی، اس کی وجہ قرآن ہے اور قصّۂ قرآن، کہ قرآن میں کسی اور پیغمبرؑ کے زمانے میں جو امام تھا، وہ زیادہ نمایاں نہیں ہے، لہٰذا رسول اکرمؐ نے اپنی حیثیت اور مولا علی کی حیثیت، ان دونوں حیثیتوں کی تشبیہہ

۱۔ ترجمہ: جس نے اپنی روح کو پہچان لیا بلا شک اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔ (میزان الحقائق:۶۹، صنادیق جواہر:۴۱۶، ۵۲۳، ۶۷۲، تجربات روحانی:۱۵۳، دعا مغز عبادت:۵۱، دیوانِ نصیری اور بہشتے استرک:۹۶، شہد بہشت:۱۱۰، ۲۱۳، ۲۱۶، ۲۲۷، صنادیق جواہر:۹۴، ۳۲۰، ۴۱۶، ۵۲۳، ۶۷۲، عشق سماوی:۶۰، ۱۳۲، عملی تصوّف اور روحانی سائنس و روحانی سائنس کے عجائب وغرائب:۲۴، ۵۰، ۷۹، قرآنی سائنس حصّۂ دُوم:۱۹، ۱۸۵، ۲۴۹، کتاب لعلاج، علمی علاج:۳۵، میزان:۳۵، کنوزالاسرار:۱۷۴، گنج گرانمایہ:۱۶۰، میزان الحقائق:۸۷، نور ایقان:۸۸، نور عرفان:۱۰، ۱۳، ہزار حکمت:۴۸۹، ۵۰۴، ۵۳۹، ۴۴۴)

موسیٰ اور ہارون سے دی اور ایک پل بنایا، تاکہ لوگ ذہنی طور پر یہاں سے چل کے قصۂ موسیٰ کا اور قصۂ ہارون کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ہارون کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے؟ یعنی خدا کا ارشاد کیا ہے؟ اور آئینۂ ہارونی میں مولا علیؑ کے اوصاف کو دیکھا جائے، سَلٰمٌ عَلٰی مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ (۱۲۰:۳۷) اس طرح نورِ سرمدی میں موسیٰ اور ہارون زندہ ہیں، ایک اسماعیلی کو جب وہ امامؑ کا ذکر کرتا ہے، یہ کہنا مناسب ہے کہ امامؑ کو ہارونِ زمانؑ کہیں اور سلیمان دورانؑ کہیں، اس لئے کہ امام کے نور میں وہ تمام مقدس ہستیاں (اور) ان کے تمام مراتب موجود ہیں اور قرآن میں جہاں کہیں کسی عظیم پیغمبر کا ذکر آتا ہے تو اس کا اشارہ امامؑ کی طرف ہوتا ہے کہ وہ بات روحانیت میں اب بھی موجود ہے، اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (۱۲۱:۳۷) ہم اسی طرح احسان کرنے والوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں، آپ دیکھتے ہیں کہ خداوند عالم کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ ہر پیغمبر سے متعلق جو کچھ ارشاد ہوتا ہے، اس کو اصول اور قانون کے طور پر سمجھا دیا جائے اور بار بار یہ فرمایا جاتا ہے کہ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (۱۲۱:۳۷) ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں، جیسا بدلہ ہم نے موسیٰ اور ہارون کو دیا تھا، تو جب دنیا میں احسان ختم نہیں ہوا ہے اور احسان کا سرچشمہ ہادیِ برحق ہیں، انسان کامل ہے تو پھر اس کی ذات میں وہ سارے مراتب، وہ سارے معجزات موجود ہیں، جو انبیائے سلف کے زمانے میں تھے، اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۲۱:۳۷) ایسا نہیں فرمایا جاتا ہے کہ وہی ایک مومن تھے، بلکہ فرمایا جاتا ہے وہ ہمارے مومنین میں سے تھے، اس واقعے کو عمومیت کا درجہ دیا جاتا ہے، تو پیغمبروں میں جو بات تھی، وہ خاص بات نہیں تھی، وہ کامل انسانوں میں عام بات تھی، تمام انبیاء و ائمہؑ کو خداوند عالم مومنین کے لقب سے یاد کرتا ہے، اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۲۲:۳۷) موسیٰ اور ہارون ہمارے مومنوں میں سے تھے، اگرچہ اس میں مومنین سے مراد انبیاء و ائمہ علیہم السّلام ہیں، لیکن اس میں دوسرے عام مومنین کی بھی حوصلہ افزائی ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السّلام بھی شروع میں عام مومنین ہوتے ہیں اور عام سطح سے ان کی ترقی ہوتی ہے، تو یہ مومنین کیلئے بہت بڑی رحمت ہے، جو خداوند عالم نے فرمایا کہ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۲۲:۳۷) تو اس مرتبے کو مومنین کی نسبت سے عمومیت کا درجہ دیتا ہے اور پھر جملہ مومنین کو حوصلہ عطا فرماتا ہے، وَ اِنَّ اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۱۲۳:۳۷) بیشک الیاس بھی مرسلین میں سے تھا، اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اَلَا تَتَّقُوْنَ (۱۲۴:۳۷) جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو؟ کیا تم نہیں ڈرتے ہو؟

اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِیْنَ (۱۲۵:۳۷) کیا تم ایک بت جو بعل کے نام سے تھا، اس کو پکارتے ہو؟ اور احسن الخالقین کو چھوڑتے ہو؟ یہاں پر ہمارے سامنے ایک سوال پیدا ہوتا ہے، "احسن

الخالقین" یہ خداوند عالم کا نام ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ احسن الخالقین، خالق تو واحد ہونا چاہیئے؟ یہاں پر خالقین کا لفظ کیوں آیا؟ اس کے بارے میں اہل ظاہر کے نزدیک کوئی ایسی بات ہے، جس کو باور کرنا ہمارے لئے مشکل ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ بیشک خالقین ظاہر میں اور باطن میں بہت ہیں، جس طرح ظاہری طور پر کوئی کاریگر ہے، وہ کسی چیز کو بناتا ہے، وہ خالق ہے، کوئی بت تراش بت بناتا ہے، وہ اس کا خالق ہے، اس طرح کچھ روحیں ہیں، جو چیزوں کو بناتی ہیں، جیسے روحِ نامیہ ہے، روحِ حیوانی ہے وغیرہ، مثال کے طور پر کوئی غلاظت ہے، کوئی گندگی ہے تو موسم گرما میں اس کے اندر جراثیم پیدا ہوجاتے ہیں، ہمارے بزرگانِ دین کے نزدیک یہ اللہ نہیں ہیں، اللہ کیلئے عیب ہے کہ ایک ایسی چیز کو پیدا کرے، جو ناقص ہے، جس طرح دنیا میں کوئی کاریگر ایک ناقص چیز کو پیدا کرتا ہے تو اس کو شرم آتی ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خدا معیوب چیزوں کو پیدا کرے؟ کمزوری کو پھیلائے، آیت سے ظاہر ہے کہ وہ احسن الخالقین ہے، وہ جو کچھ پیدا کرتا ہے بہترین چیز پیدا کرتا ہے، اور اس سلسلے میں بہت ساری وضاحتیں آتی ہیں، تاہم ہم اتنا کہہ کے آگے بڑھتے ہیں کہ خداوند عالم کا نام احسن الخالقین درست ہے، ہمارے بزرگانِ دین نے اپنی گرانمایہ کتابوں میں اس کا ذکر فرمایا ہے، اَحۡسَنَ الۡخَالِقِیۡنَ ۝ اللّٰهَ رَبَّكُمۡ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الۡاَوَّلِيۡنَ (۳۷:۱۲۵ تا ۱۲۶) وہ احسن الخالقین اللہ ہے، جو تمہارا پروردگار ہے اور تمہارے آباؤاجداد کا پروردگار ہے، فَكَذَّبُوۡهُ تو لوگوں نے اس کو جھٹلایا، فَاِنَّهُمۡ لَمُحۡضَرُوۡنَ (۳۷:۱۲۷) پس نتیجے کے طور پر وہ حاضر کیے گئے باز پرس کیلئے اور سزا کیلئے، اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِيۡنَ (۳۷:۱۲۸) مگر جو مخلص بندے تھے، وہ اس سزا سے، اس باز پرسی سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے، وَتَرَكۡنَا عَلَيۡهِ فِى الۡاٰخِرِيۡنَ (۳۷:۱۲۹) اور ان کی وہ سنت روحانی طور پر آنے والوں میں رکھی گئی۔

سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلۡ يَاسِيۡنَ (۳۷:۱۳۰) اِلۡ يَاسِيۡنَ پر سلام ہو، یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، یہ اِلیاسین کون ہے؟ دنیائے شیعت کے علماء نے ائمۂ آل محمدؐ کے توسط سے اس مقام پر اس آیت کو اس طرح پڑھا، آلِ یاسین کہا، یعنی سلامتی ہو آل یاسین پر یعنی محمدؐ کے آلؑ پر، یاسین آنحضرتؐ کا نام ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ یہاں پر ایک ربط ہے، اس سے پہلے الیاس کا ذکر گزر گیا ہے، لہٰذا یہاں پر اِلۡ يَاسِيۡنَ لفظ بھی ہوسکتا ہے، لیکن پھر بھی ہم اپنے بزرگان دین نے جو کچھ کہا ہے، اس سے ہم کیسے انکار کرسکتے ہیں، تو اس کی توجیہہ ہے، وہ توجیہہ یوں ہے کہ قرآن کی کسی آیت کے دو مطلب نہیں، اس سے زیادہ بھی مطلب بھی ہوسکتے ہیں، اور خداوند عالم کی یہ عادت ہے کہ کسی راز کی بات کو بتانے کیلئے یا چھپانے کیلئے اس کا علم تقاضا کرتا ہے کہ کوئی مناسب جگہ ہو، جس طرح دنیا میں کوئی بادشاہ کسی خزانے کو چھپانا

چاہتا ہے تو اس کیلئے مناسب جگہ کی ضرورت ہے، جس طرح اہل ظاہر کیلئے ایک ہی لفظ کو بعض دفعہ سات قسم کی قرأتوں سے پڑھنا جائز ہے، تو اس میں آل یاسین بھی صحیح ہے اور اِلْ یَاسِیْنَ بھی صحیح ہے، ربط کے لحاظ سے اِلیاسین صحیح ہے، لیکن جس طرح تاویل کی یہ عادت ہے، تاویل کا یہ قانون ہے کہ کہیں بھی ایک دم سے تاویل آجاتی ہے اور تاویل ربط کے ساتھ بھی آتی ہے اور ربط کے بغیر بھی آجاتی ہے، جہاں ربط کے بغیر آتی ہے تو ایک آیت کو بدرجۂ ایک کتاب کے مانا جاتا ہے، ایک آیت بجائے خود ایک کتاب، لہٰذا اس کتاب کے اندر کوئی بھی بیان آسکتا ہے، کوئی بھی بات آسکتی ہے، گویا کہ خداوند عالم نے اپنی بے پناہ حکمت سے آیتوں کو کتابوں کا درجہ دیا ہے اور پھر کتابوں کو جوڑ کے اس نے قرآن بنایا، یہ بہت اچھی مثال ہے اور یہ بہت خوب بات ہے، ہر آیت بجائے خود ایک کتاب ہے، لیکن خداوند عالم نے کتابوں کو ترقی دیا ہے، ان کے آپس میں ربط بھی ہے، کیونکہ ہر آیت بجائے خود ایک آیت ہے تو ربط کی کیا (بات)، جو اونچی حقیقتیں ہیں دونوں باتوں کے درمیان درمیان چلتی ہیں، تو یہ اِلیاسین بھی ہے اور آلِ یاسین بھی ہے، سَلٰمٌ عَلٰۤی اِلْ یَاسِیْنَ (۷۳:۱۳۰) اور آل محمد سلامتی پر ہیں اوّل تا آخر، اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ (۳۷:۱۱۰) ہم اسی طرح احسان کرنے والوں کو بدلہ دیا کرتے ہیں، آپ دیکھتے ہیں کہ "كَذٰلِكَ" کا لفظ بار بار آتا ہے، اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ (۳۷:۱۳۲) دیکھیں کہ ہر پیغمبر کو مومنین کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ وہ ہمارے مومنوں میں سے تھا، وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۳۷:۱۳۳) اور بیشک لوطؑ بھی مرسلین میں سے تھا، اِذْ نَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ (۳۷:۱۳۴) جب ہم نے اس کو نجات دی اور اس کے لوگوں کو نجات دی، اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ (۳۷:۱۳۵) مگر ایک بڑھیا تھی، جس کو ہم نے پیچھے رہنے والوں میں رکھا، یہ کہتے ہیں کہ لوط علیہ السّلام کی اہلیہ تھی، جس کو ہلاک ہوجانے والوں کے ساتھ ہلاک کر دینا تھا، ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ (۳۷:۱۳۶) پھر پیچھے رہنے والوں کو ہم نے ہلاک کیا۔

وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَیْهِمْ مُّصْبِحِیْنَ (۳۷:۱۳۷) اور تم صبح کے وقت ان پر گزرتے ہو، یہ کیوں کہا؟ کہ جو لوگ زمانۂ لوط میں ہلاک ہوگئے ہیں، ان پر تم ہر صبح گزرتے ہو؟ جن لوگوں سے قرآن کا خطاب ہے، اُن سے فرمایا جاتا ہے کہ تم صبح کے وقت ان لوگوں کو دیکھتے ہو، جو زمانۂ لوط میں ہلاک ہوگئے ہیں، وَبِالَّیْلِ (۳۷:۱۳۸) اور رات کے وقت بھی دیکھ سکتے ہو، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۳۷:۱۳۸) پھر اصرار فرماتا ہے، زور دیتا ہے، کیا تم نہیں جانتے ہو؟ توجہ دلاتا ہے، دیکھو، سوچو، تم ان کو دیکھتے ہو، تو یہ روحانیت کی بات ہے، روحانیت ایک ایسا مقام ہے، جہاں پر انبیاء علیہم السّلام کے زمانوں میں جو لوگ ہلاک ہوگئے یا جن کو نجات ملی، ان

سب کو دیکھا جاسکتا ہے، یہ کہ روحانیت کا demonstration ایسا جامع ہے کہ اس میں ساری مثالیں، تمام واقعات، جملہ معجزات موجود ہیں، اس لئے یہاں پر توجہ دی جاتی ہے، جو تم صبح کے وقت خصوصی عبادت کرتے ہو یا رات کے وقت شب بیداری کرتے ہو تو اس میں تم میں سے جو لوگ روحانیت تک رسا ہیں، وہ ان چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں، میں اس آیت کو دوبارہ پڑھتا ہوں: وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ (۳۷:۱۳۷) اور تحقیق تم البتہ گزرتے ہو اوپر ان کے صبح کو، اور ترجمہ میں اس نے یوں کیا ہے، دوسرے ترجمہ میں، یہاں دو ترجمے ہیں، اور تم ان پھر (دیار و مساکین) پر صبح ہوتے اور رات میں گزرا کرتے ہو، گزرا کرتے ہو، تو سارے دن کو چھوڑ کر اگر ظاہری طور پر ان کی تباہ شدہ بستیوں سے گزرنا مقصود و مراد ہے تو یہ کیوں فرمایا گیا کہ تم صبح کے وقت اور رات کو گزرتے ہو؟ اس کا گزر صبح کے وقت ہو اور رات کے وقت ہو، دن کے وقت کیوں گزر نہیں ہونا چاہئے؟ ظاہر بات ہے کہ یہ روحانیت سے متعلق ہے، جسمانیت سے متعلق نہیں ہے، لیکن ترجمہ کرنے والے نے جب رستہ نہیں پایا تو اپنے لئے اس نے الفاظ کے وسیلے سے رستہ نکالا، تاکہ لوگ باور کریں کہ یہ سمجھتا ہے۔

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۳۷:۱۳۹) پھر اس کے بعد یونس علیہ السّلام کی بات آتی ہے، کہا گیا کہ یونس بھی مرسلین میں سے تھا، اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (۳۷:۱۴۰) جس وقت بھاگ گیا طرف کشتی بھری ہوئی کے، فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ (۳۷:۱۴۱) تو وہاں پر ایک نہنگ سامنے تھا، جس کو آج کل وہیل مچھلی کہتے ہیں یا کوئی اور نام، تو جب کشتی روکی گئی، اس جانور کی وجہ سے تو پھر قرعہ اندازی ہوئی، اور پھر وہ قرعہ یونس علیہ السّلام کے نام پر نکلا۔۔ (یہاں پر لیکچر ختم ہوجاتا ہے)

ٹائپ ونظرثانی: احمد ندیم سمویو

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ قیامت کی چند حکمتیں (از کتاب قرۃ العین، صفحہ: ۵۲)

کیسٹ نمبر: Q-28　　　تاریخ: ۲۳/ دسمبر/ ۱۹۸۲، کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آج آپ عزیزوں کے سامنے سورۂ قیامہ کے بارے میں کچھ تاویلی مفہومات پیش کئے جاتے ہیں اور اِس سلسلے میں سب سے پہلے آیت نمبر (۱) میں اللہ تعالیٰ جلہ شانہٗ قیامت کی قسم کھاتا ہے۔ نمبر (۲) آیت میں بھی خداوندِ عالم قسم کھاتا ہے اور وہ نفس لوّامہ سے ہے یعنی نفسِ لوّامہ کی قسم کھاتا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، کہ قرآنِ عزیز میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے، اُس میں سب سے پہلے دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اُس میں اُس چیز کی عظمت و بزرگی پائی جاتی ہے جس کی اللہ نے قسم کھائی ہے، دوسری چیز یعنی دوسری حکمت یہ ہوتی ہے، کہ جس بیان کو پیش کرنے کے لئے یا جس مضمون کو شروع کرنے کے لئے قسم کھائی گئی ہے وہ مضمون یا وہ بیان بہت بڑی اہمیت کا حامل ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اِس سورت کے آغاز میں جس طرح خدائے تبارک وتعالیٰ نے روزِ قیامت کی قسم کھائی ہے، اِس کے بارے میں کسی بھی باہوش مومن کو شک نہیں، کہ یقیناً قیامت جس کا دوسرا نام رُوحانیت ہے بہت بڑا دن ہے اور بہت ہی عظیم وقت ہے، اور اِس کے بارے میں زیادہ وضاحت کی ضرورت نہیں ہے اور دوسری بات جو آیت نمبر (۲) میں ہے، یہ ہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے نفسِ لوّامہ کی قسم کھائی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ نفسِ لوّامہ کے کیا معنی ہیں اور اِس کی کیا عظمت و بزرگی ہے، کہ جس کی وجہ سے خدا نے اس کی قسم یاد فرمائی ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نفسِ لوّامہ کے معنی ہیں، ایسا جی یا ایسی جان یا ایسا نفس جو خود کو بُرائی کے خلاف ملامت کرتا ہے یعنی (self blaming) کرتا ہے اور اِس کی فضیلت یہ ہے کہ علمِ نفس کے مطابق یا تصوّف کے مطابق، نیز حقیقت کے مطابق نفسِ لوّامہ نیچے سے دوسرے درجے کا نفس ہوا کرتا ہے، یعنی سب سے ادنیٰ نفس نفسِ امّارہ ہے اور اُس کی کچھ اصلاح اور کچھ ترقّی کے بعد یہ نفس نفسِ لوّامہ کہلاتا ہے، یعنی نفسِ امّارہ میں یہ صلاحیت نہیں، کہ وہ خود کو ملامت کرے بلکہ وہ ہمیشہ بُرائی کا حکم دیتا رہتا ہے، خدا کی رحمت و ہدایت سے جب اُس کی کافی کچھ اصلاح ہو جاتی ہے، تو پھر ایسا نفس نفسِ لوّامہ کہلاتا ہے، جو بہت ہی ترقّی کی علامت ہے، کہ وہ خود کو اپنے آپ میں ملامت کرتا ہے، اور خدائے حکیم کی نظر میں یہ بات

بہت ہی پسندیدہ ہے کہ کوئی مومن نفسِ لوّامہ کے مقام پر ہو اور وہ (self blamming) سے کام لے کر اپنی ذات اور اپنے نفس کی اصلاح کرتا رہے۔ اسی مطلب کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے خدائے حکیم نے نفسِ لوّامہ کی قسم کھائی ہے، اِس کے بعد تیسری (۳) آیت میں جس موضوع کے آغاز کے لئے قسم کھائی گئی تھی اُس موضوع کا آغاز ہوتا ہے اور وہ قیامت اور اُس میں مُردوں کا جی اُٹھنا ہے۔ اِس آیت کے اندر انسان کی جسمانیت میں جتنی بھی چیزیں ہیں مثلاً خون، گوشت اور چار اَخلاط وغیرہ کو چھوڑ کر ہڈیوں کا ذکر فرمایا گیا ہے اور ارشاد ہے کہ آیا ہم ہڈیوں کو جمع نہیں کر سکتے ہیں؟ تو یہ ہڈیوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیوں ہے؟ یہ ایک سوال ہے اور دوسری آیت میں بھی یعنی نمبر (۴) میں بھی ہڈیوں کا ذکر ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ قرآنِ عزیز میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن میں مُردوں کے زندہ ہونے کے سلسلے میں ہڈیوں کی مثال لی گئی ہے جیسے سورۂ یٰسین میں وغیرہ، تو اِس کی حکمت یوں ہے، کہ انسان کی جسمانی ہستی میں سب سے ٹھوس چیز ہڈی ہوا کرتی ہے، لہٰذا ہڈی کی مثال دے کر اِس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ پروردگارِ عالم انسان کی دوسری زندگی میں بکھرے ہوئے لطیف ذرّات کو اکھٹے کر کے اُس میں سے انسان کو باشعور بنائے گا، اور انسان کی جیسی حیثیت ہے یا جیسا درجہ ہے اُس کے مطابق اُس کو اُن لطیف ذرّات کی یکجائی سے زندہ کیا جائے گا، لہٰذا لطیف ذرّات کی مثال ہڈیوں سے دی گئی ہے، تو یہ خلاصہ نمبر دو اور نمبر تین کا ہے، اِس کے بعد یہ خلاصہ نمبر تین اور نمبر چار کا ہے۔

اُس کے بعد نمبر پانچ (۵) میں یہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ انسان گناہ کو اپنے آگے رکھنا چاہتا ہے، اِس میں یہ اشارہ ہے کہ گناہ کا جو لفظ ہے یا گناہ کا جو ذکر ہے ایک سطح سے شروع ہو کر دین کی بنیادی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے، اور پھر وہاں پر یہ ذکر ٹھہر جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دین میں سب سے بڑا گناہ شرک ہے، لہٰذا قرآن میں جہاں جہاں گناہ کا ذکر ہے، تو وہ قانونِ حکمت کے مطابق شرک کی ایک تشریح ہونی چاہئے اور ناقابلِ معافی گناہ جو بھی ہے اسی کا شدّت سے ذکر ہونا چاہئے اور ایسا ہی ہے، تو اِس میں لفظِ امام بھی آیا ہے، ''اَمَامَہٗ'' آگے کو کہا جاتا ہے اور اگر تاویل کی باریکی میں جائیں، تو اِس کا مطلب کچھ اِس طرح سے بنے گا کہ بعض لوگوں نے اِس دنیا کے اندر امام کو چھوڑ کر امام کی نافرمانی کرتے ہوئے اپنے سامنے گناہ کو رکھا ہے۔ نمبر چھ (٦) آیت میں فرمایا جاتا ہے کہ پوچھا جاتا ہے یا پوچھنے کا خیال ہے یا ہر انسان کے ذہن میں یہ ایک سوال ہے کہ قیامت کا وقوع کب ہوگا؟ یہ ایک سوال ہے شعوری طور پر بھی اور لاشعوری طور پر بھی، اِس کے لئے جواباً یہ نمبر چھ کی بات تھی، تو نمبر سات (۷) میں جواب دیا جاتا ہے، کہ قیامت اُس وقت واقع ہوگی جب آنکھیں خیرہ ہو جائیں، جب آنکھوں میں چکا چوند آجائے اور آیت کے اندر ''بَرِقَ'' جو برق سے ہے یہ لفظ آگیا ہے اور اِس میں ایک ایسے واقعے کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں تیز روشنی کی وجہ سے انسان کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اب اِس پر بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ ممکن ہے کہ ہر شخص ایسی روشنی کو دیکھے، ایسے نور کو دیکھے جس سے کہ اُس کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں، لیکن یہ ناممکن ہے

اِس لئے کہ قرآن ہی نے خود بتا دیا کہ جس کے دل کی آنکھ اِس جہان میں نہیں کھلتی ہے وہ اندھا ہی چلا جائے گا (۱۷:۷۲) پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قیامت ہو اور لوگوں کے سامنے نور چمکے اور اُس نور سے لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ اِس کا جواب کس طرح دیا جائے، اِس کا جواب تاویل میں جو امامؑ کا خزانہ ہے موجود ہے، وہ یہ کہ اِس سے یہ مراد ہے کہ حدودِ دین میں سے کسی شخص پر جب قیامت گزرتی ہے، تو وہ نور کو دیکھتا ہے، اُس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، وہ شخص ایسا نہیں ہوتا ہے، کہ پہلے اس کو عملاً قیامت کا تجربہ ہو، وہ مومن ہوتا ہے، وہ پاک باز ہوتا ہے اور وہ عابد و ذاکر ہوتا ہے باقی اُس کو رُوحانیت کے واقعات سے کچھ خبر نہیں ہوتی ہے لیکن جب یکا یک اُس پر قیامت گزرنے لگتی ہے تو اسی کے ساتھ ساتھ اُس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، تو یہ ذکر اسی کا ہے اور سب لوگوں کی قیامت بھی اُسی وقت برپا ہوتی ہے، یہ نشاندہی کے طور پر ہے، یہ علامت بتانے کے طور پر ہے، ایسا نہیں ہے کہ ہر شخص پر یہ جو بات کی گئی ہے گزرتی ہے، بلکہ حق تو یہ ہے کہ قیامت کے سلسلے میں جہاں قرآن میں بہت ساری سختیوں کا ذکر آیا ہے یعنی ایسی سختی کا جو سزا کے طور پر نہیں بلکہ قیامت کی کیفیت کے طور پر، وقوعِ قیامت کے سلسلے میں جن سختیوں کا ذکر آتا ہے اُن سختیوں کا تعلق سب سے پہلے اُن حضرات سے ہے جو راہِ رُوحانیت پر ہر چیز کو عملاً دیکھ پاتے ہیں، تو حدودِ دین میں سے اُس شخص کی آنکھیں اُس نور کی روشنی کے سامنے خیرہ ہو جائیں گی تب لوگوں پر قیامت واقع ہوگی، یہ قیامت کی ایک پختہ اور یقینی علامت ہے۔

آیت نمبر آٹھ (۸) میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کی دوسری علامت یہ ہے کہ اُس میں چاند گہہ جائے گا، چاند کو گرہن لگے گا۔ اب چاند کی تاویل جیسا کہ آپ جانتے ہیں حجّت ہے، چاند کی تاویل حجّت ہے لیکن اِس کے ساتھ ساتھ جس مرید کو امامؑ سے واصل ہو جانا ہے وہ حجّت سے ہو کر واصل ہو سکے گا، لہٰذا وہ بھی چاند کہلائے گا۔ چنانچہ چاند گرہن کے یہ معنی ہیں کہ مومن امام سے جاملنے کے لئے یا امام سے جاملنے کے سلسلے میں اپنی صلاحیتوں سے بے نور ہو جائے گا تاکہ وہ امامؑ میں فنا ہو جائے کیونکہ کسی چیز کے فنا ہو جانے کے یہ معنی نہیں کہ اُس کی اپنی خودی برقرار رہتی ہو۔ امامؑ کے نور کے سامنے اُس کی ہستی، اُس کی ساری صلاحیتیں بے نور ہو جائیں گی۔ پھر نمبر نو (۹) آیت میں فرمایا گیا ہے، کہ تیسری علامت یہ ہے کہ سورج اور چاند ایک ہو جائیں گے، یعنی ایسا مومن اپنی طرف سے بے نور ہو جانے کے بعد، فنا ہو جانے کے بعد، امام سے واصل ہو جائے گا جو آفتابِ ہدایت ہیں اور شمسِ دین ہیں، دین کے سورج ہیں، تو یہ قیامت کی تین علامتیں بتائی گئیں، اب دوسری طرف سے یہ ہے، کہ اُس وقت انسان کہے گا کہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے (۱۰) یعنی وہ نظریاتی اور عقلی عذاب میں مبتلا ہو جائے گا، جب حدودِ دین پر یہ واقعات گزریں گے کہ کوئی عظیم رُوح امام سے جاملنے لگے گی یا خود حجّت تو اُس وقت اِس نمائندگی میں لوگوں کی قیامت برپا ہوگی اور بہت سی رُوحیں زبانِ حال سے کہنے لگیں گی کہ اب ہمیں قیامت نے جو آن گھیر لیا تو اِس کے لئے ہم کہاں بھاگیں گے، اُن کے نظریات، اُن کے عقائد، اُن کے خیالات جو ہیں وہ سب غلط ثابت ہو کر اِس قیامت

کے نتیجے میں وہ عقلی عذاب میں گرفتار ہو جائیں گی، پھر وہ رُوحیں زبانِ قال سے نہیں زبانِ حال سے کہنے لگیں گی کہ اب ہے کوئی بھاگنے کی جگہ تاکہ ہم اِس عقلی اور نظریاتی عذاب سے چھٹکارا پا کر وہاں پناہ لیتیں، یہ نمبر دس آیت کی بات ہے۔

نمبر گیارہ (۱۱) میں فرمایا گیا ہے کہ کہیں بھی پناہ نہیں ہے، پھر نمبر بارہ (۱۲) میں ارشاد ہے کہ صرف تیرے پروردگار کے پاس ٹھکانہ ہے، یہ اشارہ ہے کہ جن لوگوں نے دنیا میں اپنے ربِّ کریم کو پہچان لیا ہے اُن کے لئے قیامت کے موقع پر پناہ گاہ ملے گی اور وہ پروردگار کا حضور ہے اور جن لوگوں نے خدا کو نہیں پہچانا ہے اُن کے لئے کہیں بھی ٹھکانہ نہیں ہے۔ نمبر تیرہ (۱۳) میں ارشاد ہے کہ انسان کو اُس وقت بتادیا جائے گا کہ اُس نے قیامت کے لئے کیا آگے بھیجا ہے اور دنیا میں کیا چھوڑا ہے یا یہ کہ اُس کو ازل کی طرف سے بھی اور ابد کی طرف سے بھی احوال بتادئے جائیں گے، شعوری طور پر بھی اور لاشعوری طور پر بھی۔ چودہ (۱۴) میں فرمایا گیا ہے کہ بلکہ انسان اپنی ذات سے، اپنے اعمال سے بے خبر نہیں ہے وہ واقف ہے اور وہ کئی طرح سے ہے، حدِ قوت میں بھی اور حدِ فعل میں بھی، شعوری طور پر بھی اور لاشعوری طور پر بھی انسان اپنے حالات سے باخبر ہے، وہ دیکھتا ہے اور سُن سکتا ہے، وہ اِس طرح سے بھی دیکھ سکتا ہے کہ خداوندِ عالم نے ہر انسان کے لئے دین میں یعنی دینِ اسلام میں نورِ بصیرت مقرر فرمادیا ہے، یہ ایک طرح سے دیکھا جائے، تو سب انسانوں کا نور رہے اور اگر انسان اپنے اِس نور سے رُجوع کرتا ہے تو اِس کی روشنی میں وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہے، لہٰذا خدا نے اپنی طرف سے کسی بھی چیز کی کوئی کمی نہیں رکھی ہے، دین میں ہر نعمت پوری ہے اور ہر چیز مکمل ہے، لہٰذا قیامت کے دن خداوندِ عالم انسانوں کے متعلق فرماتا ہے، کہ انسان کو اندھیرے میں نہیں رکھا گیا ہے، اُس کے دیکھنے کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ سب چیزیں دنیا میں مہیّا تھیں، پندرہ (۱۵) میں فرمایا جاتا ہے، گو کہ وہ معذرت چاہے گا اور بہت سے بہانے تلاش کرے گا، شعوری طور پر یا لاشعوری طور پر جب انسان عذاب میں مبتلا ہو جائے گا تو کہنے لگے گا، کہ میرے لئے یہ موقع نہیں تھا، یہ نہیں تھا، یہ نہیں تھا لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے، کہ قیامت کے اِس عدل و انصاف کے موقع پر کسی کام کی کمی خدا کی طرف آئے اور لوگوں کی حجّت خدا پر قائم ہو، یعنی دنیا کی مثال میں قیامت ایک کیس ہے، ایک مقدّمہ کی طرح ہے لیکن وہ بڑے عدل و انصاف کے ساتھ ہے، دنیا کی دھاندلیوں کی طرح نہیں، تو اُس میں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ لوگ یہ ثابت کرسکیں کہ خدا کے فلاں فلاں کام میں کمی تھی اِس بناء پر وہ حقیقت کے سمجھنے سے قاصر رہے اور پھر اِس میں خدا کی نعوذ باللہ منہا غلطی ثابت ہو جائے، یہ بات ناممکن ہے۔

اِس کے بعد نمبر سولہ (۱۶) میں مضمون ذرا بدل جاتا ہے، فرمایا جاتا ہے کہ اے رسولِ کریم! آپ پر جو آسمانی وحی نازل ہوتی ہے اِس سلسلے میں آپ وحی کو ظاہر کرنے کے لئے عجلت سے کام نہ لیں، ”لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ“ اِس وحی کے سلسلے میں آپ زبان کو حرکت نہ دیں تاکہ آپ اِس میں عجلت کریں اور دوسری طرف سے یہاں ایک رُوحانی

حکمت اور رُوحانی تاویل بھی ہے لیکن معلوم نہیں، کہ میں اِس کی وضاحت کرنے کا مجاز ہوں یا نہیں، بہر حال زبان کو حرکت نہ دینے کا ایک فرمان ہے کہ زبان کو خصوصی عبادت میں کیوں حرکت نہ دینی چاہئے، کیوں نہیں ہلانی چاہئے اُس کا فرمان یہاں پر بھی موجود ہے کہ زبان کو حرکت دینے سے ایک بہت عظیم طوفان برپا ہو جاتا ہے، گو کہ وہ طوفان بھی عظیم ہے اور پُر فائدہ ہے لیکن اُس کا بوجھ سہارنا بہت بڑا مشکل ہے، یہ نمبر سولہ کی حکمت ہے۔ نمبر سترہ (۱۷) میں ارشاد ہے کہ خداوندِ عالم فرماتا ہے کہ اِس ساری وحی کو جمع کرنا اور پڑھ کر سنانا ہمارے ذمّہ ہے، یہ تنزیل ہے اور اِس کی تاویل شاید میں آپ کو بتا سکوں گا اور اجازت ہوگی، وہ یہ کہ عرصۂ دراز تک مومن صبح نورانی عبادت میں کوشش کرتا رہتا ہے، لیکن کامیابی نہیں ہوتی ہے، اُس کا ہر لفظ، ہر ذکر، ہر اسم جواہرات سے زیادہ انمول یعنی بیش بہا ہے لیکن کسی نتیجے کے بغیر اُس کے سارے ذکر جو رُوح کے منہ سے نکل جاتے ہیں وہ بکھر جاتے ہیں اور آپ یہ سن کر بڑے خوش ہوں گے، کہ خدا فرماتا ہے کہ اگر مومن صبر سے کام لے اور آگے بڑھے تو ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے، کہ اُس میں مومن کے اِن تمام لعل و گوہر کو میں ہی جمع کر کے اِس پر جمع کروں گا اور اُس نے جتنے پڑھ پڑھ کر بول کو بکھیر دئے تھے میں اُن کو واپس اُس پر پڑھوں گا اور جمع بھی کروں گا۔ یہ بہت ہی پیاری حکمت ہے اور بہت ہی گرانقدر ہے، اِس میں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر نمبر اٹھارہ (۱۸) میں ارشاد ہوتا ہے، ''فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِـعۡ قُرۡاٰنَهٗ'' اے رسول! جب ہم آپ کو وحی پڑھ کر سنائیں گے، تو اُس وقت ہماری اِس پڑھائی کی پیروی کرنا یعنی ہم آپ کے آگے آگے پڑھیں گے، تو آپ اُس کے پیچھے پیچھے جس طرح ہم پڑھتے ہیں اِس طرح آپ پڑھ کر سنانا، یہ اِس کی تنزیل ہے اور تاویل اسکی بہت زیادہ شاندار ہے وہ یہ کہ جب ہم اُس وقت جس میں کہ ہم بکھرے ہوئے لعل و گوہر کو تمہارے لئے جمع کرتے ہیں، اُس وقت ہم ہی پڑھیں گے، تمہارا بول ہم ہی بولیں گے، تمہارے اسمِ اعظم کو ہم ہی رٹیں گے، تو اُس وقت گویا تم نے نہیں پڑھنا ہے، ہم نے پڑھنا ہے، اُس حالت و کیفیت میں اسمِ اعظم (automatic) ہو جائے گا، خود کار انداز سے بولنے لگے گا، اُس وقت تم نے کیا کرنا ہے، تم نے بس پیروی کرنی ہے، پیچھے پیچھے چلنا ہے اور سننا ہے، تمہارا زور برائے نام ہوگا کیونکہ اسم خود بخود بولتا چلا جائے گا، اور تم صرف ہم آہنگی کے طور پر اور توجّہ کے طور پر سنتے چلے جانا ہے، تو اُس وقت تمہارے اگلے جتنے اسم پڑھے گئے تھے، جتنے اسم بکھر گئے تھے وہ سب ہم جمع کر کے تم کو واپس لوٹا دیں گے، یہ نمبر اٹھارہ۔

اُس کے بعد نمبر انیس (۱۹) میں ارشاد ہوتا ہے کہ اُس کے بعد اِس کا بیان ہم پر ہے، ہمارے ذمّہ ہے، تنزیل کے طور پر اِس کا مطلب یوں ہے کہ اے رسول! جب ہم قرآن پڑھنے لگیں گے، تو آپ ہمارے پڑھنے کی پیروی کرنا اور پھر اُس کے بعد اِس تنزیل کی تاویل ہمارے ذمّہ ہے، اِس تنزیل کی تاویل ہمارے ذمّہ ہے۔ قرآن میں جو لفظِ تاویل ہے وہ تنہا نہیں ہے اُس کے کئی مترادفات بھی ہیں، ایک تو حکمت ہے اور ایک بیان ہے، آپ جب پیر

ناصرِ خسروؔ کی مشہور کتاب جو تاویل سے متعلق ہے پڑھنے لگیں گے، تو اُس میں آپ کو لفظِ بیان آئے گا اور بیان تاویل کے لئے آئے گا، یہاں بھی بیان سے تاویل مراد ہے، تو قرآن کی تنزیل کے بعد تاویل کی ذمہ داری بھی اللہ ہی پر عائد ہو جاتی ہے، اِس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تنزیل کے بعد تاویل کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے رسول نے کچھ نہیں کرنا ہے، حدیثوں سے، روایات سے اور دیگر ذرائع سے رسولؐ نے کچھ نہیں کرنا ہے بلکہ یہ اللہ کے ذمہ ہے کہ وہ رسول کے ایک صحیح جانشین کو قائم کرے، اور رسول اس کی تصدیق کرے، پھر اللہ کی یہ ذماَ ہ داری اِس طرح سے پوری ہو جائے۔ یہ بہت ہی شاندار آیت ہے کہ ''ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ'' (۱۹) جس طرح تنزیل میں لوگوں کا کوئی حصہ نہیں تھا، تنزیل اللہ کی طرف سے تھی، اسی طرح تاویل بھی لوگوں کی طرف سے نہیں اللہ کی طرف سے ہوگی، اور تاویل کے اللہ کی طرف سے ہونے کی صورت یہ ہوگی کہ جس طرح تنزیل ایک کامل انسان پر ہوئی اسی طرح تاویل بھی ایک کامل انسان کے وسیلے سے ظاہر ہوگی اور وہ کامل انسان امامِ عالی مقام ہے یہ انیس آیت کی حکمت ہے، اور اِس کے بعد نمبر بیس (۲۰) میں فرمایا جاتا ہے کہ ہرگز ایسا نہیں، قرآن میں ''کَلَّا'' ہرگز ایسا نہیں، جب بھی آتا ہے تو خداوندِ عالم یہ اشارہ فرماتا ہے، کہ تم جس طرح سوچتے ہو، تمہارے جیسے نظریات ہیں، تمہارے پاس جیسا علم ہے وہ صحیح نہیں ہے، تو ''کَلَّا'' میں خداوندِ عالم لوگوں کے نظریات کی تصدیق نہیں کرتا ہے بلکہ تردید کرتا ہے۔ پھر اِس کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ ''بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ'' تو یہ سارا نقص کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ یہ اِس لئے پیدا ہوتا ہے کہ تم دنیا کو چاہتے ہو، لوگ جس طرح امامؑ سے دستبردار ہو جاتے ہیں وہ دنیا کو چاہنے کی وجہ سے ہے اور اللہ انسانوں کی اِس بنیادی غلطی کی نشاندہی فرماتا ہے۔

اکیس (۲۱) میں فرمایا گیا ہے کہ ''وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ'' اور تم آخرت کو چھوڑتے ہو، بائیس (۲۲) میں ہے کہ قیامت کے دن کئی چہرے تر و تازہ ہوں گے، بہت سے چہرے تر و تازہ ہوں گے۔ اب اگر ہم اِس تر و تازگی کی وضاحت کریں، تو دل کو خوشی ہوگی، وہ یہ کہ خدا جس چیز کو تر و تازگی قرار دیتا ہے یا جس چیز کی تعریف وہ تر و تازگی کے لفظ سے کرتا ہے، تو اُس کا کیا حال ہوگا، ہمیں سمجھنا چاہئے کہ خدائے حکیم نے رُوح کو جس شان سے پیدا کیا ہے وہ بڑی عجیب ہے خدا نے اپنی کاریگری، اپنی حکمت، اپنی ساری قدرت سے کام لے کر انسان کی رُوح کو پیدا کیا ہے، چنانچہ جو مومنین قیامت میں رستگار قرار پائیں گے، تو وہ اپنی اصلی حالت میں ہوں گے، جیسے ان کی رُوح ازل میں پیدا کی گئی تھی، اور اِس کی سب سے بڑی وجہ کیا ہوگی، وہ یہ کہ اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے، ''اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ'' تو یہ تیئیس (۲۳) نمبر کی آیت ہے، دنیا کے اندر اہلِ اسلام دیدارِ خدا کے متعلق دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کچھ کا کہنا ہے کہ دیدار نہیں ہوگا، کچھ کا کہنا ہے کہ دیدار ہوگا، جو لوگ دیدار کے قائل ہیں وہ اِس آیت کو اپنی بنیادی دلیل قرار دیتے ہیں ''اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ'' کہ وہ لوگ جو تر و تازگی میں ہیں، اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے یعنی خداوندِ عالم کا دیدارِ اقدس اُن کو حاصل ہوگا، اسی

لئے وہ تروتازہ ہوں گے۔یہ تیئس (۲۳) نمبر کی آیت تھی، اور کتنے منہ ایسے ہوں گے کہ وہ بدرونق ہوں گے یعنی اُن کو خداوندِ عالم کا دیدار حاصل نہیں ہوگا اور وہ گمان کریں گے کہ اُن کے ساتھ کمر توڑنے والا معاملہ کیا جائے گا، یہ پچیس (۲۵) آیت ہے ''کَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ'' ایسا ہرگز نہیں، جبکہ جان ہانس کو پہنچ جائے گی یعنی گلے کو، یہ چھبیس (۲۶) آیت ہے اور کہا جائے گا کہ کوئی جھاڑنے والا ہے یعنی کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہے؟ کہ وہ ہم کو اِس تکلیف سے بچائے، یہ ستائیس (۲۷) آیت تھی ''وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ'' اور گمان کیا جائے گا کہ اب جدائی ہے، یہ اٹھائیس (۲۸) آیت تھی، ''وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ'' اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی (۲۹) ''اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ'' یہ تیس (۳۰) آیت ہے، کہ اُس روز کہیں بھی جانا نہیں ہے، کہیں بھی پناہ نہیں مل سکتی ہے، مگر جانا تیرے پروردگار کی طرف ہے، پناہ وہاں ملتی ہے، نجات وہاں ہے، یہ تیس آیت پوری ہوگئی۔

''فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى'' (۳۱) جو لوگ قیامت میں اِس طرح سے گرفتار ہو چکے اُس کی کیا وجہ تھی؟ اُس کی وجہ یہ تھی کہ ہر اُس شخص نے جو قیامت میں گرفتار ہوگا تصدیق نہیں کی تھی اور نماز نہیں پڑھی تھی، تصدیق نہیں کی تھی اور نماز نہیں پڑھی تھی۔تصدیق کس چیز کی اور کس ذریعے سے اور نماز کیسی؟ تصدیق دین میں دو مقام پر ہوسکتی ہے، حقائق کی یعنی معبود کی الوہیت کی، رسولؐ کی رسالت کی تصدیق یا تو عینُ الیقین کے مقام پر ہوسکتی ہے یا علمُ الیقین کے مقام پر، اِس کے بغیر کوئی تصدیق نہیں ہوسکتی ہے، اگر کسی کی طرف سے مقامِ عینُ الیقین پر دین کی تصدیق ہوگئی، خدا کی، رسولؐ کی، امامؑ کی، تو یہ اُس کی بہت بڑی خوش نصیبی ہے، نہیں تو ایک مقام اور رہتا ہے وہ ہے علمُ الیقین، یہ دوسرے درجے کی تصدیق ہے۔علمُ الیقین کے مقام پر ضرور تصدیق ہونی چاہئے یعنی جس علم کو یقینی علم کہا جاتا ہے، اُس کی روشنی میں خدا و رسولؐ اور امام کی، قیامت کی اور ہر چیز کی تصدیق ہونی چاہئے، علم میں آنا چاہئے، سمجھنا چاہئے، جاننا چاہئے، یقین کرلینا چاہئے، یہ ہوئی تصدیق اور اگر یہ مقام حاصل نہیں ہے اور مقامِ عینُ الیقین خود حاصل نہیں ہے، تو پھر اِس کا (opposite) کیا بنتا ہے؟ تکذیب بنتا ہے، جو تصدیق نہیں ہے تو اُس کا عکس ہے، اُس کا ((opposite)) ہے، اُس کی ضد ہے، وہ تکذیب ہے یعنی جھٹلانا ہے۔چنانچہ اب دنیا کے اندر بہت سے مذاہب ہیں اور اہلِ مذاہب ہیں یعنی مذہب والے، وہ خیال کرتے ہیں، کہ تصدیق کرتے ہیں دین کی لیکن لاشعوری طور پر وہ تکذیب کرتے ہیں، جھٹلاتے ہیں، کیونکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا تصدیق کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے یا دو مقام کی ضرورت ہوتی ہے۔درجۂ اوّل کی تصدیق دل کی آنکھ سے دیکھ کر ہے اور وہ مقامِ عینُ الیقین ہے، یعنی یقین کی آنکھ سے مشاہدہ کرکے، خدا کی صفات کو، رسولؐ کی رسالت کو، قرآن کے نزول کو، دین کو، اسلام کو، ملائکہ کو، آخرت کو اور ہر چیز کو، ہر چیز کو دیکھنا، سمجھنا، اطمینان حاصل کرنا۔یہ تصدیق کوئی لفظی چیز نہیں ہے، یہ کوئی تحریر نہیں ہے، یہ کوئی (agreement) نہیں ہے، یہ کوئی اور طرح کا (confirmation)

نہی ہے بلکہ صرف جاننا ہی ہے،تو یہ عینُ الیقین کا جو مقام ہے وہ درجہ اوّل کی تصدیق ہے،یہ نہ ہو تو دوسرا ایک درجہ اور ہے جو آسانی کے لئے ،اُس کا (level) کم ہے،پست ہے،وہ ہے علمُ الیقین ـ یقینی علم سے ہر چیز کو جاننا تو یہ تصدیق ہے،اب یہ تصدیق کی وضاحت ہوئی ـ اب ’’صَلّٰی‘‘ نماز کی تصدیق کیا، نماز کی تاویل کیا؟ نماز دعوتِ حق کو کہتے ہیں، دیکھا آپ نے اِس آیت کے اندر یعنی دونوں باتیں بالکل صحیح (arrangment) میں ہیں، صحیح ترتیب میں ہیں، پہلے علم کا ذکر ہے پھر دعوت کا ذکر ہے، ایسا نہیں کہ پہلے دعوت کا ذکر ہو پھر علم کا، کہ جس کو دعوت کرنی ہے پہلے اُس کا علم حاصل کرنا چاہئے، اسی میں تصدیق بھی آگئی اور پھر دعوت کی بات آتی ہے، کہ دعوت بعد میں ہوتی ہے اور علم پہلے آتا ہے، تو اِن گرفتار شدگان نے دنیا کے اندر تصدیق نہیں کی تھی یہ پہلا گناہ تھا، اور دوسرا گناہ یہ کہ انہوں نے نماز نہیں پڑھی یعنی دعوتِ حق میں حصہ نہیں لیا، جو اسلام کی سچّی دعوت ہے اُس میں انہوں نے کام نہیں کیا، اِس لئے یہاں گرفتار ہیں اور کوئی بات نہیں ہے، یہی ایک بنیادی چیز ہے، اور اب نمبر بتّیس (۳۲) ہے، تو اِس میں فرمایا جاتا ہے، کہ لیکن اُس نے تکذیب کی اور منہ پھیرا، تو جو تصدیق نہیں کی، تو اُس نے تکذیب کی یعنی جھٹلایا اور منہ موڑا اسے مراد یہ ہے، کہ جو حقیقت تھی، جو مرکزِ ہدایت تھا، جو نورِ خدا تھا اُس سے منہ موڑا ـ

اِس کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ ’’ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهۡلِهٖ يَتَمَطّٰى‘‘ (۳۳) اِس کے بعد وہ شخص اپنے لوگوں کی طرف ناز کرتے ہوئے چلا گیا، بہت عالیشان اشارہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص امامؑ سے روگردان ہونے کے بعد فخر یہ محسوس کرتا ہے، کہ وہ بہت کچھ جاننے والا ہے، اپنے چیلوں میں، مریدوں میں فخر سے واپس لوٹتا ہے، کہتا ہے کہ میرا نظریہ، میرا علم اور میرا شعور ایسا ہے، تو وہ اپنے آپ کی تعریف کرتا ہے، یہاں پر اُس کا ذکر ہے کہ حق سے منہ موڑنے کے بعد وہ فخر کرتا ہے، ناز کرتا ہوا اپنے لوگوں کی طرف لوٹتا ہے، قرآن کہتا ہے کہ ’’اَوۡلٰى لَكَ فَاَوۡلٰى‘‘ (۳۴) تو کم بختی پر کم بختی آنے والی ہے تجھ کو، اُس کے بعد پھر اسی مطلب کو دہرایا جاتا ہے جو پینتیس (۳۵) نمبر کی آیت ہے، ’’ثُمَّ اَوۡلٰى لَكَ فَاَوۡلٰى‘‘ پس، وائے ہے، کم بختی ہے تیری، کم بختی پر کم بختی ہے ـ اُس کے بعد انسان کی جسمانی تخلیق کی مثال پیش کی جاتی ہے (آیت نمبر ۳۶ تا ۴۰) انسان کی جسمانی تخلیق اور جسمانی تکمیل پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی، تاکہ کوئی سوچے کہ جس خالق نے، جس خدا نے انسان کی اِس ظاہری شخصیت کو پیدا کیا، انسان کے جسم کو بنایا، تو اُس کو باقاعدہ اور اُصول کے مطابق بنایا، کہیں کسی مقام پر اِس کو نظر انداز نہیں کیا، شروع سے لے کر آخر تک اِس کے لئے مکمل انتظام، مکمل بندوبست اور صحیح ذرائع سے اِس کی جسمانی تربیت کی، یہ ایک قطرہ تھا، پھر گوشت کا ایک لوتھڑا بن گیا، تو یہ شروع میں ایک حقیر چیز تھا، لیکن خدا نے اِس کو نظر انداز نہیں کیا، ایک قطرے کی بھی کس شان سے اُس نے پرورش کی اور گوشت کے لوتھڑے کو کس طرح پالا اور کیسے کیسے حالات سے اِس کو گزارا، پھر ایک مکمل انسان بنا کے اِس کو دنیا کی روشنی عطا کی، تو کسی بھی مرحلے

میں اِس کے لئے کوئی تکلیف، کوئی اذیت، کسی چیز کی کمی نہیں ہوئی۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رُوح کی تخلیق اور رُوح کی تکمیل جو اِس سے زیادہ ضروری ہے اُس کے وسائل میں کوئی کمی ہو، ہدایت میں کوئی کمی ہو، رُوحانی غذا کا ذریعہ دنیا میں کبھی ہو اور کبھی نہ ہو، کبھی وقت ایسا بھی ہو، کہ رسول بھی ہو اور آسمانِ وحی بھی آئے اور ساتھ ساتھ اولیاء یا آئمہ بھی ہوں اور اُس کے بعد پھر ایک وقت ایسا بھی ہو کہ اُس میں نہ تو پیغمبر موجود ہے، نہ آسمان سے کوئی ہدایت کا سلسلہ باندھا ہوا ہے، نہ اُس میں کوئی ولی ہے، امام ہے، کوئی نہیں ہے بس صرف یہ ہے کہ لوگ آپس میں اختلافات کریں اور روایات در روایات چیزوں کے پیچھے پڑیں اور اُن میں یقینی کوئی بات نہ ہو بس سارا وقت اختلافات میں گزر جائے، یہ کیسے ہوسکتا ہے، تو خدا نے اِس پوری کائنات کے اندر سے جو اہم چیزیں ہیں: جیسے سورج ہے، چاند ہے، ستارے ہیں، ہوا ہے، پانی ہے، زمین ہے ، رزق ہے، روزی ہے، موسم ہے، اِس میں سے کوئی چیز کو نہیں کم کیا اتفاق سے۔ ایک ہی شان سے دنیا کا نظام چلتا رہا ہے، اور جسمانی طور پر کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے، تو پھر دین کے سلسلے میں اور رُوحانی ہدایت کے سلسلے میں، پرورش کے سلسلے میں کس طرح یہ ہوسکتا ہے کہ خدا اِن (sources) کو لوگوں کے درمیان سے اُٹھالے جائے مگر یہ بات الگ ہے، کہ خدا ہر چیز کو اپنی جگہ پر رکھے اور لوگ ہی اپنی غلطیوں کی وجہ سے، دنیا طلبی کی وجہ سے، سیاست کے سبب سے، دشمنی کی بنیاد پر اُن ذرائع سے لوگ محروم رہیں، یہ تو قدرت کا کوئی قصور نہیں ہے، لوگوں کا اپنا قصور ہے، اُن کی اپنی غلطی ہے، تو چنانچہ میں اس مقام پر اِس تشریح کو ختم کرتا ہوں اور اب ایک تحریری شکل میں ایک مقالہ آپ کے سامنے ہے وہ پڑھا جائے گا۔ [مقالہ: سورۂ قیامت کی حکمتیں]

سوال: (شاہدہ محی الدین) سر! یہاں ایک بہت بڑا سوال ہے کہ فرمایا گیا کہ اپنی حیثیت کے مطابق زندہ کر دیا جاتا ہے آخرت میں تو کیا آخرت کی زندگی لوگوں کے درجات اور ہدایت کے مطابق الگ الگ ہے، ہر ایک کا شعور اس کی علم اور روحانیت اور نظریے کے مطابق مختلف ہے تو کیا ہر شخص کو اسی طرح کی زندگی یعنی شعور میں زندگی ملتی ہے؟

جواب: انہوں نے مقالے کو پڑھتے پڑھتے آخر میں اسی مقالے کے حوالے سے ایک اہم سوال کو اُٹھایا کیونکہ مقالے میں یہ کہا گیا ہے کہ خداوندِ عالم کے لوگوں کو زندہ کر دینے کے دو مقام ہیں، ایک تو یہ دنیا ہے جس میں مرگِ نادانی سے، مرگِ جہالت سے لوگوں کو خدا زندہ کرتا ہے نورِ علم سے، تو وہ ایک حقیقی زندگی ہے اور دوسرا وہ مقام ہے یعنی آخرت جس میں خدا لوگوں کو اُن کی حیثیت کے مطابق زندہ کرتا ہے، تو اِس کا مطلب یہ ہے، کہ قیامت کے دن جس طرح ایک مومن کو حقیقی زندگی ملے گی، ایک کافر کو وہ نہیں ملے گی۔ اُس کی حیثیت کے مطابق زندگی یہ ہے کہ وہ لاشعوری طور پر برائے نام زندہ کہلائے گا، وہ کچھ نہیں سمجھے گا لیکن ترجمانی کے طور پر یہ سب کچھ اُس کی طرف سے کہا جائے گا کہ فلان کافر جہنم میں اِس

طرح سے ندامت میں تھا، عذاب میں تھا اور اُس نے یہ کہا وغیرہ وغیرہ، تو یہ صرف (interpretation) کے طور پر کہا جائے گا اور ہوسکتا ہے کہ وہ جو کافر ہے وہ زندہ ہی نہ ہو اور وہ ایک ادنیٰ ہستی میں مبتلا ہو اور صرف ایک منٹ کے لئے ہم مانیں گے کہ اگر یہ کہا جائے، کہ جانوروں میں بھی کچھ ایسی رُوحیں مبتلا ہیں جو گناہ گار رُوحیں ہیں تو کیا اِس صورت میں جانوروں کی رُوحیں اپنے عذاب کو سمجھ سکتی ہیں؟ یا دیکھتی ہیں یا سنتی ہیں؟ نہیں! کچھ بھی نہیں سنتی ہیں اور کچھ بھی نہیں دیکھتی ہیں، ہاں! اگر خداوندِ عالم اُن کی اُس صورتِ حال کی کچھ ترجمانی کرے، کچھ (interpretation) دے تو اُس سے کچھ بات بنتی ہے اور وہ بات ایسی کہ اُن کی رُوحیں کہتی ہیں کہ ہم مبتلا ہیں عذاب میں، ہم کو دنیا میں بھیجا جائے وغیرہ وغیرہ، تو یہ ساری باتیں اِس (interpretation) سے بنتی ہیں اگر اُن کی ذات سے دیکھا جائے، تو وہ کوئی زندگی ہی نہیں ہے۔

لہٰذا اِس آخری جملے میں جس طرح سے کہا گیا ہے، کہ ہر شخص کو اُس کی حیثیت کے مطابق زندہ کر دیا جائے گا، تو زندگی کے مدارج ہیں، (stages) ہیں، جس طرح ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اُگنے والی نباتات، مثلاً گھاس پات، درخت یہ بھی زندہ ہیں لیکن اِس کو حیوانات سے کم تر زندگی ملی ہے اور درختوں میں بھی اگر (categories) کریں تو اُن میں بھی (categories) ہوسکتی ہیں، مثلاً آپ دیکھیں گے نباتات میں، اُگنے والی چیزوں میں کچھ بیلیں ایسی ہیں کہ وہ کسی اندھے کی طرح یا کسی ایسے آدمی کی طرح جو رات کی تاریکی میں دیوار کی تلاش کرتا ہے یا لاٹھی کی تلاش کرتا ہے یا آدمی کی تلاش کر کے کسی چیز کو پاتا ہے، تو اُس کا سہارا لیتا ہے، اِس طرح کچھ بیلیں ہیں اُن کے اندر ریشے ہیں، دھاگے ہیں تو وہ جھاڑ سے، درخت سے اور دوسری گھاس سے وہ جو ریشہ ہے، جو دھاگہ ہے وہ لپٹ جاتا ہے، تو اِس قسم کی نباتات کو ایک طرح سے دیکھا جائے تو دوسری نباتات سے اِن کے اندر ذرا سا شعور ہے۔ اسی طرح جو جانور ہیں وہ جانور ایک جیسے نہیں ہیں، اُن کی مختلف (categories) ہیں، کچھ جانور انسان کے قریب ہیں، کچھ دُور ہیں شعور کے لحاظ سے، مثلاً سدھانے والے جانور جیسے بندر ہے یا گھوڑا ہے یا دوسرے ایسے جانور جو کچھ سیکھ سکتے ہیں وہ انسان کے قریب ہیں اور اِس معاملے میں کہنا چاہئے کہ بندر جو ہے وہ انسان سے بہت قریب ہے چونکہ وہ انسان کی نقلیں اتارتا ہے، اور بہت سی چیزیں انسان کی طرح کرتا ہے، تو اِس سے ثابت ہوا کہ زندگی جو ہے مختلف مراحل میں ہے مختلف درجات میں ہے، مراتب میں ہے۔ اب آیئے انسان کے اندر اور انسان کے اندر جو ہے کئی زیادہ مراتب پائے جاتے ہیں، کیونکہ انسانیت کا جو دائرہ ہے یا انسانیت کی جو دنیا ہے وہ بہت ہی وسیع ہے، نباتات کی دنیا ہے وہ زیادہ وسیع نہیں ہے، جتنا وسیع جانوروں کی ہے اور جانوروں کا عالم زیادہ وسیع ہے اور جانوروں کے مقابلے میں انسان کی جو دنیا ہے وہ بہت زیادہ عظیم

ہے اور بہت زیادہ وسیع ہے یعنی کہ اِس کے اندر مختلف قسم کے انسان پائے جاتے ہیں مختلف قسم کی زندگیاں پائی جاتی ہیں۔اسی مثال کے مطابق قیامت میں جو زندگی ملے گی وہ اعلیٰ سے اعلیٰ بھی ہوگی اور ادنیٰ سے ادنیٰ بھی، مختلف حیثیتوں میں زندگی پائی جائے گی، تو لہٰذا خدا انسانوں کو وہاں زندہ کرے گا۔

اصل میں، میں بتاؤں، یہ جو قرآن کے اندر مردوں کو زندہ کرنے کا جو ذکر آتا ہے، سچ بتائیں اور حکمت کی روشنی میں بتائیں تو اس کا زیادہ سے زیادہ تعلق اِس دنیا سے ہے، تو جیسا کہ اِس مقالے کے اندر بتایا گیا کہ جہالت موت ہے، علم زندگی ہے اور خدا جن کو چاہتا ہے مرگِ جہالت سے نورِ ہدایت اور نورِ علم کی روشنی میں زندہ کرتا ہے، خدا جو کہتا ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کرے گا یا کرتا ہے، تو اِس کا زیادہ سے زیادہ اطلاق اِس دنیا کے اندر ہے اور جو لوگ مرتے ہیں تو مر گئے، جو جسمانی طور پر جو کافر اور جو بے دین، جو نافرمان مر گئے، تو اُن کو قیامت کے دن کیسی زندگی ملے گی اور کہاں ملے گی؟ زندگی یہیں سے ہے اور مردگی یہیں سے ہے، تو جو مومن یہاں زندہ نہ ہو جائے وہ کہاں زندہ ہو سکتے ہیں، تو یہ ہے مرنے کے بعد زندہ ہونے کی حکمت۔ یہ صحیح ہے کہ مومن جو یہاں زندگی پائے گا، تو اُس کی زندگی جو ہے وہاں دو چند ہو جائے گی، اُس میں روشنی آئے گی، اُس کی وجہ یہ ہوگی کہ یہ جو جسم ہے، کثیف جسم، اِس کے سامنے سے ہٹ جانے سے مومن کو زیادہ روشنی ملے گی، یہ بات صحیح ہے، پر کافر کو کوئی زندگی ملے گی تو اِس کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے، شکریہ، اسی کے ساتھ یہ گفتگو یا یہ کلاس۔۔۔۔

نوٹ: یہ مقالہ ۲۳/دسمبر/ ۱۹۸۲، کراچی میں تحریر کیا گیا، بارِ دیگر اِس کو ۸/جولائی/ ۱۹۹۱، لندن میں تحریر کیا گیا جو کتاب قرۃ العین میں چھپ چکا ہے۔

ٹرانسکراب اور ٹائپنگ: نجمہ بیگ　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　پُروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی (ق) کا پُرحکمت بیان

عنوان: سورۂ جمعہ کی حکمتیں

کیسٹ نمبر: Q-29　　　تاریخ: ۳۱ رمئی ر ۱۹۸۴، کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آج سورۂ جمعہ کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے، اِس لئے کہ اِس سورے کی بہت بڑی اہمیت ہے اور اس کی کئی خصوصیات ہیں، اِس مقدّس سورے کے آغاز میں فرمایا گیا ہے، کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتا ہے، یعنی کائنات کی ہر چیز یا تو زبانِ قال سے یا زبانِ حال سے خدائے سبحان کی پاکیزگی بیان کرتی ہے، وہ بادشاہ ہے، قدّوس ہے، غالب ہے اور حکیم ہے (۶۲:۱)۔ اِن چند اسماء میں سب سے پہلے اسمِ "مَلِكِ" آتا ہے یعنی بادشاہ جو اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم نام ہے، چونکہ بادشاہ کے تصور میں انتہائی بلند معنیٰ ہوا کرتے ہیں جیسے ہے "اَلْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ" (۶۲:۱) ظاہر ہے کہ اس میں "مَلِكِ" سب سے پہلے آتا ہے، اِس ترتیب میں جو سب سے پہلے اسم آتا ہے وہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اِس کے بعد ارشادِ بارِتعالیٰ ہے، کہ اس نے "اُمِّيِّين" میں ایک رسول کو مبعوث فرمایا کہ وہ اُن پر اُس کی آیات پڑھا کرتے ہیں اور اُن کو پاک کرتے ہیں اور اُن کو کتاب وحکمت سکھایا کرتے ہیں، اور اِس سے قبل وہ صریح گمراہی پر تھے (۶۲:۲)۔ اِس آیۂ کریمہ میں "اُمِّيِّين" سے متعلق ایک بحث پیدا ہوجاتی ہے کہ "اُمِّيِّين" کا کیا مطلب ہے؟ چنانچہ "اُمِّيِّين" کے تین معنی ہیں: ایک معنی ہیں دنیوی تحریر کے اعتبار سے اَن پڑھ لوگ، دوسرے معنی ہیں خدائی تحریر کے لحاظ سے اَن پڑھ لوگ، اور اِس کے تیسرے معنی ہیں وہ لوگ جو "اُمّ" سے یعنی ماں سے منسوب ہیں اور اِس کے تینوں معنی درست ہیں۔ پہلے معنی اہلِ تفسیر کے نزدیک، دوسرے اور تیسرے معنی اہلِ تاویل کے نزدیک درست ہیں، چونکہ آنحضرت ﷺ شروع شروع میں خدا کی تحریر میں ناخواندہ تھے، مگر پروردگارِ عالم نے آپؐ کو دوسرے لوگوں سے ممتاز کرکے خدائی تحریر سے آشنا کردیا، یہ دوسرے معنی ہیں اور تیسرے معنی کے اعتبار سے رُوحانی ماں باپ کا تصور جس طرح ہمارے نزدیک مسلّمہ ہے اِس طرح رُوحانی ماں سے منسوب ہوتے ہیں اور حضرات اَئمہ بھی رُوحانی ماؤں سے منسوب ہوتے ہیں اور انہی حضرات کی جنس میں سے رسولؐ کو بعث کیا گیا، اور انہی پر آیاتِ خداوندی پڑھی جاتی ہیں، اور انہی کو پاک کیا جاتا ہے، اور انہی کو کتاب وحکمت سکھائی جاتی ہے اور اِس سے پہلے وہ ناآشنا تھے۔

یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوجاتا ہے، وہ ہے ''وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ'' (۶۲:۲) یاد رہے کہ قرآن میں ''ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ'' دو طرح سے آیا ہے، ایک یہ کہ کسی شخصیت کے ابتدائی احوال اور آخری احوال کے مقابلے میں یہ بات کہی گئی ہے، ایک یہ کہ کسی شخص کے اوّل تا آخر احوال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ''ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ'' قرار دیا گیا ہے، تو اِس میں بہت بڑا فرق ہے۔ اِس تصور سے ہمارا وہ سوال بھی حل ہوجاتا ہے جو ''وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى'' (۹۳:۷) سے اُٹھتا ہے یعنی رسولِ اکرمؐ سے فرمایا گیا ہے، کہ آپ کو گمراہ پایا یا غلطی پر پایا اور پھر خدا نے آپ کی ہدایت کی، یہ اُس بلند ترین معیار کے مطابق بات کہی گئی ہے جس پر رسولؐ پورے اترے تھے یعنی یہ رسولؐ کی ہدایت اعلیٰ کا معیار ہے، تو ایسے میں کوئی عیب کی بات نہیں، کیونکہ رُوحانی ارتقاء کے بعد جو ابتدائی حالات نظر آتے ہیں وہ صحیح نہیں لگتے ہیں۔ آیتِ سوم میں ایک عظیم حکمت یہ ہے، کہ خدا نے ارشاد فرمایا اور دوسروں کے لئے بھی اِن میں سے جو ہنوز اِن میں شامل نہیں ہوئے (۶۲:۳) یعنی رسولؐ کی یہ شان ہے، کہ آپ نے جس طرح اپنے وقت کے مومنین پر آیاتِ خداوندی پڑھ کر سنائی اور اُن کو پاک کیا، اُن کو کتاب و حکمت سکھائی، اِس طرح دوسرے آنے والے مومنین کے لئے بھی اِس کا امکان ہے اور وہ بھی اُن اگلے مومنین سے جا مل سکتے ہیں، یعنی رسولؐ اپنے جانشین کے توسّط سے مستقبل کے مومنین کو بھی بالکل اسی طرح سے پاک و پاکیزہ کرسکتے ہیں، جس طرح زمانۂ نبوّت کے مومنین کو پاک و پاکیزہ کرکے کتاب و حکمت کی دولت سے مالا مال کردیا گیا تھا۔ اسی کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے کہ ''وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' اور اللہ تعالیٰ اِس پر قادر ہے، غالب ہے اور وہ حکمت والا ہے، وہ اپنی قدرت سے اور حکمت سے ہر زمانے کے مومنین کو نورِ نبوّت کا فیض پہنچا سکتا ہے۔ جس طرح اسماعیلی تصور ہے، کہ تمام زمانوں کے مومنین کا حق ہے کہ اُن کو ہدایتِ الٰہی کسی فرق و امتیاز کے بغیر ملتی رہے، اِس سے ظاہر ہے کہ جو مومنین امامِ وقت کی اطاعت کرتے ہیں وہ باطنی طور پر اُس زمانے کو پاتے ہیں جو عہدِ نبوّت میں تھا، جیسے ارشادِ نبوی ہے کہ ''اَنَا مَدِيْنَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِيٌّ بَابُهَا'' گر مانا جائے کہ یہاں علیؑ سے امامِ زمان مراد ہیں، تو امامِ زمان کے توسّط سے ہر زمانے میں دروازۂ شہرِ علم کھل سکتا ہے، اور یہاں پر یہ بھی عرض کروں، کہ قرآن کے اگر کسی سورے کی فضیلت بیان کی گئی ہے، تو اُس کی وجہ ظاہری عبارت یا ظاہری الفاظ نہیں ہیں بلکہ اُس کا سبب اُس سورت کا باطنی پہلو ہے، اور جس طرح فقہ کی کتاب میں یہ تاکید کی گئی ہے کہ نمازِ جمعہ کے لئے سورۂ جمعہ کو پڑھا جائے، تو اِس کی وجہ اِس کی باطنی حکمتیں ہیں۔

''ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ'' یہ اللہ کا فضل ہے اور خداوند اپنا فضل جس کو چاہے دے دیتا ہے، یہاں یہ بھی یاد رہے کہ جہاں لفظِ فضل آتا ہے اُس میں رُوحانیت کے انتہائی معنی اور نورِ عقل ہوتے ہیں۔ ''وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ'' اور اللہ بڑے فضل والا ہے (۶۲:۴)۔ اِس کے بعد ایک ایسی آیت ہے جس میں اہلِ تورات کا ذکر

فرمایا گیا ہے،ارشاد ہے کہ جن لوگوں نے تورات کو اُٹھایا اور پھر انہوں نے اُس کو نہیں اُٹھایا تو اُن کی مثال گدھوں کی طرح ہے (۶۲:۵) ۔اُن کی مثال گدھے کی طرح ہے جس پر کتابیں لادی جاتی ہیں،یعنی یہود نے تورات کو تنزیل کے پہلو سے اُٹھایا مگر تاویلی حکمت کے پہلو سے نہیں اُٹھایا یعنی ظاہری معنی کے حامل تو ہو گئے مگر باطنی معنی کے حامل ہونے سے قاصر رہے،چونکہ اصل مقصد باطنی پہلو سے تھا جب انہوں نے باطنی پہلو کو نہیں سمجھا،تو اِس کی مثال یوں ہوگئی جیسے کہ کسی گدھے پر کتابیں لادی جاتی ہیں،تو گدھا کتابوں کو تو اٹھاتا ہے لیکن اُن کو ذرا بھی نہیں سمجھتا ہے۔خدائے حکیم نے یہودیوں کے کتابِ آسمانی اُٹھانے کی تشبیہہ کسی گدھے کے کتابوں کے اُٹھانے سے دی،تو سمجھنے والے سمجھ گئے کہ کسی بھی آسمانی کتاب کے باطنی پہلو کی کیا اہمیت ہوتی ہے ۔اِس کے بعد فرمایا گیا ’’بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ‘‘ اُس قوم کی مثال بُری ہے کہ جنہوں نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا (۶۲:۵) اب یہ ہمارے لئے سوچنے کی بات ہے کہ یہود قوم نے خدا کی کتاب کو جھٹلایا تو نہیں تھا مگر ہاں! اُس کے باطنی معنی سمجھنے سے قاصر رہے تھے،اِس صورت میں انہوں نے گویا خدا کی آیات کو جھٹلایا یعنی کتاب کے اصل مقصد کو نہ سمجھنا،آیاتِ خداوندی کو جھٹلانے کے مترادف ہے۔’’وَاللّٰہُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ‘‘ اور اللہ ظالم لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا (۶۲:۵) اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ظلم دوطرح سے ہوتا ہے،ایک ظلم دوسروں پر ہوتا ہے اور ایک ظلم اپنے آپ پر ہوتا ہے،یہود نے جیسے مقصدِ الٰہی کو نہیں سمجھا تو انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور جب اپنے آپ پر انہوں نے ظلم کیا،تو خدا نے اُن کی رہنمائی نہیں کی۔

’’قُلْ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰہِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ‘‘ اے رسول کہہ دیجئے،اے لوگو جو یہود ہوئے ہو اگر تمہارا یہ گمان ہے کہ تم لوگوں کو چھوڑ کر اللہ کے اولیا ہو،خدا کے دوست ہو تو اُس صورت میں تم موت کی آرزو کرو،موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو (۶۲:۶)۔
یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی دوستی کا معیار موت کس طرح قرار پا سکتی ہے؟ یعنی کیا اگر کوئی شخص موت کی خواہش کرتا ہے تو وہ خدا کا دوست بن سکتا ہے اور خدا کی دوستی کی شرط بس یہی ہے کہ کوئی مرنے کے لئے خواہش کرے۔اِس کا جواب یوں ہے کہ یہ جسمانی موت کی بات نہیں ہے،جسمانی موت کے لئے بہت سے لوگ خواہش کرتے ہیں،تو وہ خدا کے دوست نہیں بن سکتے ہیں،یہ نفسانی موت کی بات ہے،اور خدا کی دوستی کی شرط نفسانی موت ہے جو جسمانی موت سے پہلے واقع ہوتی ہے اور جو لوگ اِس کی خواہش کرتے ہیں اور اِس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں،تو وہ بے شک خدا کے اولیاء بن جاتے ہیں،اور یہ چیز سب لوگوں کو چھوڑ کر ہے،اُن کے سوا ہے،اس لئے ’’مِنْ دُوْنِ النَّاسِ‘‘ فرمایا گیا ،اور اسی آیت میں جسمانی موت سے مرنے سے قبل نفسانی موت سے مرنے کا ذکر ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔
پھر ارشاد ہوتا ہے ’’وَلَا یَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ‘‘ وہ ایسی موت کی خواہش نہ کریں گے اِس

لئے کہ اُن کے اعمال اچھے نہیں ہیں (۶۲:۷) اِس حکم میں اُن کو نفسانی موت سے مستثنیٰ قرار دیا گیا یعنی نفسانی موت کسی کی وہاں واقع ہو گی جہاں ہادیٔ برحق موجود ہو، اُس کی ہدایت کی روشنی میں، اُس کی اطاعت کی بدولت یہ موت واقع ہو سکتی ہے اور راہِ مستقیم سے ہٹ کر یہ چیز نہیں آ سکتی ہے، "وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيۡنَ" اور خداوند ظالموں کو خوب جانتا ہے (۶۲:۷) ایسی فضیلت، ایسی خواہش اور ایسا واقعہ اُن میں نہیں ہو سکتا ہے، تو اِس موت کے لئے دو مرحلے بتائے گئے، ایک تمنّا، کوشش، خواہش اور ایک واقعاً اُس موت کا واقعہ ہونا، تو مومن کو یا تو نفسانی موت سے مرجانا چاہیئے، اگر وہ نہیں تو اِس کی خواہش، اِس کی تمنّا، اِس کی آرزو ضرور ہونی چاہیئے تاکہ مومن خدا کی دوستی کے دائرے میں داخل اور شامل ہو سکے۔ خداوند ظالموں کو جانتا ہے یعنی جن لوگوں نے ظلم سے اور زیادتی سے ہادیٔ برحق کے منصب کو اپنایا اور اپنے دعویٰ کے مطابق اور رسولؐ و صاحبِ امر سے الگ ہو گئے تو اُن کو خدا ظالم قرار دیتا ہے۔

"قُلۡ اِنَّ الۡمَوۡتَ الَّذِىۡ تَفِرُّوۡنَ مِنۡهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيۡكُمۡ‌ ثُمَّ تُرَدُّوۡنَ اِلٰى عٰلِمِ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ" آپ فرما دیجئے موت وہ چیز ہے جس سے کہ تم بھاگتے ہو، پس وہ تم کو ملنے والی ہے اور اِس کے بعد تم کو عالمُ الغیب کی طرف لوٹا دیا جائے گا جو غیب اور ظاہر کا جاننے والا ہے، پس وہ تم کو آگاہ کرے گا، تمہارے اعمال کے متعلق (۶۲:۸)۔ اِس میں بظاہر یوں لگتا ہے جیسے ظاہری موت کا ذکر ہے لیکن اِس میں اسی موت کا ذکر ہے جو نفسانی موت ہے، کہ وہ موت بھی کسی نہ کسی طرح لوگوں پر واقع ہونے والی ہے اور اُس موت کے بغیر لوگ خدا کے حضور حاضر نہیں ہو سکتے ہیں۔ اِس کے بعد اِس سورہ کے دوسرے رُکوع میں ارشاد ہوتا ہے: "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُوۡدِىَ لِلصَّلٰوةِ مِنۡ يَّوۡمِ الۡجُمُعَةِ فَاسۡعَوۡا اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الۡبَيۡعَ‌ ذٰ لِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ" اے ایمان والو! جب پکارا جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن، پس تم شتابی کرو، دَوڑ پڑو ذکرِ الٰہی کی طرف اور خرید و فروخت کو چھوڑ دو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جاننے والے ہو (۶۲:۹)۔ یہ آیت تفسیر کے اعتبار سے نمازِ جمعہ کے بارے میں ہے کسی شک کے بغیر اور اُس میں حکم ہوتا ہے کہ تمام کاروبار کو چھوڑ کر جمعہ کی نماز کے لئے جمع ہو جائیں، مگر اِس کی ایک عظیم تاویل بھی ہے، اور وہ تاویل یہ ہے، کہ جب انسانِ کامل میں یعنی امام میں اور اُس کے وارث میں انفرادی قیامت برپا ہو جاتی ہے، تو اُس وقت حضرتِ اسرافیل صور پھونکتا ہے تو یہ صور نمازِ جمعہ کی اذان کی حیثیت رکھتا ہے، اُس موقع پر ذرّاتِ رُوح سے فرمایا جاتا ہے کہ اے ذرّاتِ رُوح! تم اِس نمازِ جمعہ کے لئے یعنی ذکرِ الٰہی کے لئے جس میں تمام رُوحیں جمع ہو جاتی ہیں دَوڑ پڑو اور کاروبارِ زندگی کو چھوڑ دو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جاننے والے ہو۔

پھر ارشاد ہوتا ہے "فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانۡتَشِرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰهِ وَاذۡكُرُوا

اللّٰہَ کَثِیۡرًا لَّعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ''جب یہ نماز پوری ہو جاتی ہے، تو تم وہاں سے زمین پر پھیل جاؤ اور خدا کے فضل میں سے ڈھونڈو اور کثرت سے خدا کو یاد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ (۶۲:۱۰)۔ اِس کے یہ معنی ہیں کہ وہ ذرّاتِ رُوح اِس اجتماع کے بعد اور اُن خاص دنوں میں اسمِ اعظم کے ذکر میں شمولیت کے بعد ذرّاتِ رُوح واپس بدنوں میں آجاتے ہیں اور ایک وقت تک اپنی زندگی سے دینی اور دنیوی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اِس وقت جمعہ سے متعلق ایک سوال چلتا ہے اور اِس جمعہ کے بارے میں کچھ بحثیں ہوئی ہیں، کہ جمعہ کے روز چھٹی ہونی چاہئے، تعطیل ہونی چاہئے یا نہیں، تو اِس میں دو قسم کے خیالات ظاہر کئے گئے ہیں، کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ اگر جمعہ کے پورے دن کی چھٹی ہوتی تو یہاں یہ کیوں فرمایا گیا کہ جب تم نمازِ جمعہ سے فارغ ہو جاؤ، تو تم پھر اپنے کاروبار میں پھیل جاؤ اور خدا کے فضل میں سے ڈھونڈو ایک گروہ کا یہ کہنا ہے، لیکن کچھ حضرات نے اِس میں ذرا جستجو سے کام لیا اور تحقیق کی تو حضرتِ امام جعفر صادقؑ کے حوالے سے یہ بتایا گیا کہ جمعہ کا دن سارے کا سارا عبادت کا دن ہے اور ''فَانۡتَشِرُ'' کا مطلب جو ہے وہ سنیچر ہے، دوسرا دن ہے یعنی اِس میں حکم یہ ہے کہ جمعہ کے دن عبادت و بندگی کرتے رہو اور دوسرا دن جو سنیچر ہے اُس میں منتشر ہو جاؤ، تو حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام کے حوالے سے یہ بتایا گیا، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے زمانۂ شریعت کے اعتبار سے جو اِس آیت کی تاویل بیان فرمائی ہے اُس میں کیا شک ہو سکتا ہے، وہ اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے اور اُس میں کوئی کلام نہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ اس کی یہ تاویل بھی صحیح ہے کہ جمعہ کی نماز سے انفرادی قیامت مراد ہے جس میں سب رُوحیں جمع ہو جاتی ہیں اور ذکرِ الٰہی وہاں پر ہوتا ہے اور اُس کے بعد اُن ذرّات کو واپس اپنے بدنوں میں آنا ہے اور دنیا میں پھیل کر خداوندِ عالم کے فضل میں سے کمانا ہے، تو ''یَوۡمِ الۡجُمُعَہ'' یا ''یَوۡمِ الۡجُمُعَةِ' اجتماع کا دن، اور اجتماع کا دن انفرادی قیامت ہے جو امامؑ اور اُس کے جانشین میں برپا ہو جاتی ہے، جیسا کہ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کا ایک ظاہری پہلو ہوتا ہے اور ایک باطنی پہلو ہوتا ہے اور ظاہری پہلو سے کہیں زیادہ اہم باطنی پہلو ہوا کرتا ہے۔ ''وَاِذَا رَاَوۡا تِجَارَةً اَوۡ لَهۡوَاۨ انۡفَضُّوۡۤا اِلَيۡهَا وَتَرَكُوۡكَ قَآئِمًا 'اور جب لوگ کسی تجارت کو دیکھتے ہیں یا کسی تماشے کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور آپ کو اے رسول اکیلا کھڑا کھڑا چھوڑ جاتے ہیں ''قُلۡ مَا عِنۡدَ اللّٰهِ خَيۡرٌ مِّنَ اللَّهۡوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ‌ ؕ وَاللّٰهُ خَيۡرُ الرّٰزِقِيۡنَ'' کہئے کہ خدا کے پاس جو کچھ ہے وہ تماشا سے اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہتر رزق دینے والا ہے (۶۲:۱۱)۔ اسی کے ساتھ یہ گیارہ آیات پر مشتمل سورہ اختتام کو پہنچتی ہے، اب میں چاہوں گا کہ اِس پورے سورے کے متعلق جہاں کہیں بھی مناسب ہو سوال اُٹھایا جائے تا کہ اُس میں ہم گفتگو کریں گے، شکریہ۔

تسبیح سے متعلق سوال ہے کہ کس طرح جاندار چیزیں، اُن میں انسان بھی ہے اور غیر انسان بھی ہے، پھر بے جان چیزیں یعنی تمام چیزیں کس طرح اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہیں، کیا ہر چیز کی تسبیح ایک جیسی ہے یا یہ تسبیح درجہ وار ہے، تو کس

طرح کوئی چیز کہہ سکتی ہے، کوئی بے جان چیز، کوئی جانور، کوئی کافر کہ خدا پاک ہے۔ جیسے قرآن کہتا ہے کہ "یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ" (۵۹:۲۴) ایک ہی شان سے اور ایک ہی ساتھ فرمایا جاتا ہے، کہ آسمانوں میں جو کچھ ہے اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی پاکیزگی بیان کرتا ہے۔ ہاں! اِس کے متعلق مذاکرہ ہو یا سوال ہو، اِس سے پہلے بھی شاید زبانی طور پر یا تحریری طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کو پاک و برتر قرار دینا دو طرح سے ہے، شعوری طور پر ہے اور غیر شعوری طور پر ہے، بالفاظِ دیگر معرفت کی روشنی میں ہے اور بغیر معرفت کے ہے، لیکن یاد رہے کہ جو عبادت، جو ذکر، جو تسبیح معرفت کے بغیر ہو اُس کا کوئی ثواب نہیں ہے۔ مثلاً اگر پتھر یا درخت یا جانور زبانِ حال سے خدا کی تسبیح کرتا ہے، تو اِس کا کوئی ثواب نہیں، ثواب اُس تسبیح کا ہے جو زبانِ قال سے ہو اور معرفت کی روشنی میں ہو چونکہ اِس تسبیح کے بیان کے آگے "اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ" (۵۹:۲۳) کا ذکر ہے، پاک بادشاہ کا ذکر ہے، تو خدا کی بادشاہی میں جو چیز ہے وہ چیز بہت سی مثالوں میں خدا کی بادشاہی سے مجبور ہے، جیسے کسی بادشاہ کی اطاعت دو قسم کی ہوتی ہے، اختیاری فرمانبرداری اور جبری فرمانبرداری۔ کائنات کی بہت ساری چیزوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مَقْہُور [مقہور] ہیں، مَقْہُور [مقہور] معنی کوئی طاقت اُن کو مجبور کرتی ہے، پانی کی طبیعت بلندی سے پستی کی طرف بہنے کی ہے لیکن یہ (nature) ہے اور اُس کے اندر جو خاصیت رکھی ہوئی ہے وہ خاصیت اُس کو مجبور کرتی ہے، اِس طرح بہت ساری مثالوں کو ہم دیکھتے ہیں، بہت ساری چیزوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ چیزیں کچھ چیزوں کو مجبور کر رہی ہیں، یہ سب خدا کی بادشاہی میں ہے، مَلِک کا مطلب یہ ہے۔ جہاں کہیں بھی خدا کے ناموں میں سے ایک نام مَلِک آتا ہے، تو اُس میں زبردستی کے معنی پائے جاتے ہیں، زور کے معنی پائے جاتے ہیں، طاقت کے معنی پائے جاتے ہیں، کہ دنیا کی مثال پر ہے۔

اگر اِس تسبیح کے بیان کے سامنے مَلِک کا اسم نہیں آتا تو ہم سمجھتے کہ سب چیزیں شعوری طور پر خدا کی تسبیح بیان کرتی ہیں۔ اِس کے علاوہ اِس میں معنی بھی ہیں کہ تمام چیزیں مل کر اِس جبری حالت میں اور زبانِ حال سے یہ کہتی ہیں، کہ خدا اِن کی صفت سے بالاتر ہے، یعنی دنیا کی چیزیں جیسی ہیں خدا ایسا نہیں ہے، خدا مخلوق کی صفت سے برتر ہے، اِس برتری کے معنی میں یعنی خدا کو برتر قرار دینے کے معنی میں پاکیزگی کے معنی ہیں۔ تسبیح معنی خدا کو سبحان قرار دینا، تمام صفات سے اور اُن تمام صفات سے جو مخلوق میں پائی جاتی ہیں، اللہ پاک و برتر ہے، کچھ مترجمین نے اسمِ سبحان کا ترجمہ اِس طرح سے کیا کہ ہر نقص سے اور ہر عیب سے وہ پاک ہے، یہ بہت ہی کمزور بات ہے۔ خدا کو انسانوں کے صف میں لانا اور پھر اِس صف میں سے اُس کو بلند قرار دینا یہ بات اچھی نہیں ہے۔ دنیا کی کوئی مخلوق یا کوئی مذہب، خدا کا کوئی عیب بیان کرتا ہو تو اُس صورت میں کہنا چاہئے، کہ یہ بات نہیں ہے، جب کوئی مذہب اور کوئی فرد اِس بات کو نہیں مانتا ہے، کہ خدا میں نقص ہے خدا میں عیب ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کو اِس قول سے پاک و برتر قرار دیں، یہ بات نہیں ہے۔ خدا نے خود فرمایا

ہے "سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ" (۳۷:۱۸۰) پاک ہے تیرا پروردگار جو عزّت کا پروردگار ہے یعنی عزّت کو اُٹھانے والا ہے، عزّت کو برتری دینے والا ہے، وہ خود صاحبِ عزّت نہیں ہے وہ عزّت کا پروردگار ہے، عزّت کا پالنہار ہے "سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ" پاک ہے کس چیز سے؟ اُس بیان سے جو خدا کی صفات کو بیان کرتے ہیں، وہ لوگ جو خدا کی صفات بیان کرتے ہیں، اُس بیان سے اور اُن صفات سے خدا پاک و برتر ہے اور وہ خود صاحبِ عزّت نہیں ہے بلکہ عزّت کا پروردگار ہے، عزّت کو مقامِ آخر تک پہنچا دینے والا ہے، یہ اُس کی بہت بڑی صفت ہے۔

ہمارا دوسرا سوال "اُمِّيّٖنَ" سے متعلق تھا، کہ "اُمِّيّٖنَ" کے تین معنی بتائے گئے تھے، ظاہری تحریر سے اَن پڑھ، خدائی تحریر سے اَن پڑھ اور اُم سے منسوب۔ یہ تینوں باتیں رسولؐ سے متعلق ہیں، کہ آنحضرتؐ ظاہری تحریر میں اَن پڑھ تھے، اور یہ آپ کی صفت ہے، کہ اَن پڑھ ہونے کے باوجود آپ پر آسمانی کتاب نازل ہوئی اور آپ نے آیاتِ خداوندی لوگوں پر پڑھ پڑھ کر سنائیں اور دوسری تعریف آپ کی یہ ہے، کہ آپ خدائی تحریر سے بھی اَن پڑھ تھے، جس طرح دوسرے لوگ تھے لیکن خداوند نے آپ کو خدائی تحریر کے پڑھنے کے قابل بنا دیا، اور پھر آپ نے لوگوں پر خدائی تحریر پڑھ پڑھ کر سنائی اور تیسرے معنی میں آپ اُم سے منسوب تھے، کہ آپ کی کوئی رُوحانی ماں تھیں، آپ ان میں سے تھے جن کی رُوحانی ماں ہوتی ہے، جن کے رُوحانی باپ ہوتے ہیں اور آپ کا آیاتِ خداوندی کو پڑھ پڑھ کر سنانا دو طرح سے تھا، ایک ظاہر میں اور ایک باطن میں۔ اِس مناسبت میں آپ اماموں کے ساتھ ہیں اور اماموں پر آیاتِ خداوندی پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں، اماموں کو پاک کرتے ہیں، اُن کو کتاب وحکمت سکھاتے ہیں، کتاب سے تنزیل مراد ہے، حکمت سے تاویل مراد ہے، یعنی ہر امام میں جو رُوحانی واقعات پیش آتے ہیں اُس میں نورِ نبوّت ہے۔ نور کے کئی پہلو ہیں، اُن میں سے ایک پہلو نورِ نبوّت ہے، یعنی پیغمبر لوگوں کی نسبت اماموں سے بہت قریب ہیں اور ائمہ رسول سے قریب ہیں، جس طرح کسی گھر کا دروازہ گھر سے متّصل ہوتا ہے، اور گھر اُس در و دیوار کے اندر ہوا کرتا ہے، اِس میں، میں اُس حدیث کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

آپ سوال کریں گے کہ پیغمبر اماموں کو کس طرح پاک و پاکیزہ کرتے ہیں؟ یہ سوال آپ کی طرف سے مناسب ہے اور جائز لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں آیۂ تطہیر سے متعلق کہ آیۂ تطہیر میں کس طرح تھا کہ خدا نے پنجتن کو پاک کیا اور خدا کا فعل پیغمبر کرتا ہے، پیغمبر کے توسّط سے خدا کا فعل واقع ہوتا ہے، اِس طرح اِس کے کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ پیغمبر ہر امام کو پاک و پاکیزہ کرتا ہے، پھر بھی سوال کا بڑا حصہ باقی ہے، کہ کن معنوں میں پیغمبر امام کو پاک کرتا ہے؟ اور یہ پاکیزگی کس آلودگی سے ہے، یعنی کس آلودگی کو دُور کرنے کا نام پاکیزگی ہے، دیکھئے! امام میں دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک شخصیت، بشریت، انسانیت، دوسرا نور، تو اِس شخصیت کو درجۂ کمال پر پہنچا دینے کا نام پاکیزگی ہے، نور، شخصیت کو اور شخصیت کے

ذہن کو، دل و دماغ کو منوّر کرتا ہے اور ہر قسم کی تاریکی کو دُور کر دیتا ہے۔ اسی عمل کا نام پاکیزگی ہے، اِس آیت میں خود تشریح بھی ہے "وَیُزَکِّیۡہِمۡ وَیُعَلِّمُہُمُ الۡکِتَابَ وَالۡحِکۡمَۃَ" (۳:۱۶۴) ظاہر بات ہے کہ پہلے کتاب و حکمت سے شخصیت نا آشنا ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ مراحلِ کمال طے کئے جاتے ہیں اور اسی کے ساتھ پاکیزگی ہوتی ہے۔ اِس مطلب کے سمجھنے میں اُن حضرات کو دقت پیش ہو سکتی ہے جو امام کو پیدائشی طور پر عقلِ کُل مانتے ہیں، یہ بات نہیں ہے، نور الگ ہے، شخصیت جدا ہے۔ جب نور شخصیت میں آتا ہے، تو اُس میں دو باتیں ہوتی ہیں، ایک طرف انسانیت اور بشریت ہوتی ہے اور دوسری طرف نور ہوتا ہے اور وہ نور رفتہ رفتہ اُس شخصیت کو درجۂ کمال پر پہنچا دیتا ہے اور اسی عمل کا نام پاکیزگی یا علم و کتاب، کتاب و حکمت کی تعلیم ہے۔

ہمارا ایک اور سوال اِس میں تھا کہ جو زمانۂ نبوّت میں مومنین تھے وہ تو حضور کے سامنے تھے اور اُن کو آسمانِ وحی سے براہِ راست فائدہ ملتا تھا، اب جو آنے والے لوگ تھے اُن کے لئے کیا ہونا چاہئے؟ اسی سوال کا جواب اس آیت میں ہے، کہ خدا غالب ہے اور حکیم ہے، اِس لئے وہ ایسا نظام چلا سکتا ہے کہ جس سے آنے والے مومنین زمانۂ نبوّت کو پائیں اور اِس کا وسیلہ یہ ہے کہ رسول کے جانشین کے توّسط سے لوگ رُوحانی راستے کو پائیں گے اور اُس راہ سے پیغمبر سے رُوحانی طور پر جا ملیں گے اور اُن کو بھی رسول پاک و پاکیزہ کرے گا، کتاب و حکمت سے کرے گا۔ اِس آیت کا یہ مطلب تھا اور قرآن میں کوئی بھی بات مکمل ہے اور آخری درجے تک ہے تو اُس کے متعلق فضلُ اللہ کہا جاتا ہے، خدا کا فضل اور آپ کو یاد ہے کہ فضل نورِ عقل کا نام ہے، یہاں جو پانچویں آیت ہے اُس میں یہ بہت شاندار مثال فرمائی گئی ہے کہ جن لوگوں نے تورات کو اُٹھایا پہلی بار اور پھر نہیں اُٹھایا دوسری بار تو اُن کی مثال گدھے کی سی ہے، کہ اُس کی پشت پر کتابیں ہوتی ہیں تو گدھا بے چارہ کتابوں کو تو اٹھاتا ہے لیکن اُن کو نہیں سمجھتا ہے، یعنی جس طرح یہودیوں نے تورات کو اپنایا اُس کی تشبیہہ ایک ایسے گدھے سے دی گئی ہے کہ جس کی پشت پر بہت ساری کتابیں ہوں۔ اب ہم سوچتے ہیں کہ کن معنوں میں یہودیوں نے بارِ اوّل تورات کو اُٹھایا اور کن معنوں میں بارِ دوم تورات کو نہیں اٹھایا، تو ہم اِس سوچ کے نتیجے میں، اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہودیوں نے تورات کو ظاہری معنیٰ میں تو قبول کیا لیکن اُس کے اندر جو حکمتیں تھیں وہ اُن کے سمجھنے سے قاصر رہے، لہٰذا اُن کی مثال ایک ایسے گدھے کی سی ہوئی جو کتابوں کے ایک بھاری بوجھ کو اُٹھاتا ہے پر اُن کو نہیں سمجھتا ہے، تو اسی آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جو لوگ کتاب کے مقصد کو نہیں سمجھتے ہیں وہ گویا خدا کی آیات کو جھٹلاتے ہیں، میرے خیال میں اب وقت ہو چکا ہے۔

سوال: خداوندِ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ خدا جس کو چاہے اپنے نور کی ہدایت عطا فرماتا ہے اور امام شاہ کریم الحسینی حاضر امام صلوات اللہ علیہ نے فرمایا کہ نور کو دیکھنا تمہارا حق نہیں ہے، جب خدا کی مرضی ہوگی تو تم نور دیکھ سکو گے، تو جب ہر چیز خدا نے اپنے اختیار میں رکھی ہے، تو پھر انسان کی عبادت اور بندگی کا کیا مطلب؟)

جواب: عمدہ سوال ہے اور اِس کے بہانے سے علم کا ایک حصہ، ایک اہم (portion) سامنے آسکتا ہے اور عمدہ اِس لئے ہے کہ یہاں پر جو سوال کیا گیا ہے کہ خدا کی مرضی سے اِس کا تعلق ہے اور بہت بڑا سوال ہے۔ انہوں نے میری گفتگو کے ایک حوالے سے سوال بنایا اور فرمایا کہ خدا جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی طرف ہدایت دیتا ہے، نور تک پہنچا دیتا ہے اور جو فرمانِ مقدّس کا (portion)، (quote) کیا وہ اِس آیت کے مطابق ہے، اِس میں کوئی تصادم نہیں ہے۔ اب اصل سوال کا جو مرکز بنتا ہے وہ خدا کی مرضی سے متعلق بنتا ہے کیونکہ انہوں نے پوچھا کہ ایک طرف سے خدا فرماتا ہے کہ تم یہ کرو، وہ کرو، ایک طرف سے خدا یہ فرماتا ہے کہ اُس کی مرضی کے مطابق ہر چیز ہوگی، تو اِس میں عرض یہ ہے کہ خدا کی مرضی اور اُس کا امر دو نہیں ہیں، ایک ہے، یعنی خداوندِ عالم بندوں کو حکم دیتا ہے اِس طریقے سے کہ اُس کی مرضی کے مطابق ہم کام کریں، جب ہم اس کی مرضی کے مطابق اُس کے امر و فرمان کو بجا لائیں گے تو ہمیں اُس کی مرضی کے مطابق ہدایت ملے گی اور نور تک رسائی ہو جائے گی اور یہ اِس سوال کا سہل سا مختصر سا جواب ہے، اب اِس کی تفصیل مزید یہ ہے کہ ہماری مرضی اور خدا کا حکم یہ دو چیزیں ہیں لیکن خدا کی مرضی اور اُس کا حکم دو چیزیں نہیں ہیں۔ اگر ہم اپنی مرضی کے مطابق چلیں تو ظاہر بات ہے کہ ہم خدا کی مرضی سے الگ ہو جائیں گے اور خدا کی مرضی کے مطابق ہمیں ہدایت نہیں ملے گی، اگر ہم اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں فنا کریں اور اُس کی اطاعت کو بجا لائیں، تو پھر ہماری کوشش خدا کی مرضی کے مطابق ہوگی، اُس میں کوئی سوال نہیں ہے، مطلب یہاں یہ ہے کہ ہم اپنی مرضی کو چاہتے ہیں یا خدا کی مرضی کو چاہتے ہیں۔ اگر ہم اپنی مرضی کو چاہتے ہیں، تو ظاہر بات ہے کہ ہم نامرادی سے دو چار ہو جائیں گے کیونکہ ہماری مرضی غلط ہو سکتی ہے، ہم اگر اپنی مرضی کو خدا کی مرضی سے قربان کریں اور اُس کی مرضی کے مطابق احکام کو بجا لائیں تو "یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ" (۳۵:۲۴) کے مطابق خدا چاہے گا، اُس میں کوئی اندیشہ نہیں ہے، ایسا نہیں کہ ہم سوچیں کہ خدا چاہے گا یا نہیں چاہے گا یہ معلوم نہیں، یہ تردّد ہم میں نہیں ہونا چاہیئے، اِس لئے کہ اِس سلسلے میں ہمیں خدا کی مرضی اور خدا کی مشیّت کے بارے میں جاننا ہوگا، خدا کی مرضی اگر ایک انسان کی مرضی کی طرح کبھی اُس طرف، کبھی اِس طرف ہوتی، تو اُس میں ہمیں تردّد تھا، اندیشہ تھا، فکر تھی، خدا کی مرضی ایسی نہیں ہے، وہ (set) ہے، کس چیز کے ساتھ (set) ہے؟ امر و فرمان کے ساتھ (set) ہے، اُس کے قانون کے ساتھ (set) ہے، جیسے دنیا کے اندر من مانی اُس شخص کی ہوتی ہے جس کا کوئی ضمیر نہ ہو اور کوئی بھی با اخلاق شخص جو ہے وہ ایک ہی اُصول کا پابند ہوتا ہے، وہ ایک ہی قانون کو چاہتا ہے، اِس سے بڑھ کر خدا ہے جو چاہتا بھی ہے۔ تو اپنے قانون کے مطابق چاہتا ہے، اِس چاہنے میں کوئی اندیشہ نہیں ہے، اِس اعلان میں ہمیں کوئی خوف نہیں ہونا چاہیئے، اِس اعلان سے یہ پتا چلتا ہے کہ خدا چاہے گا اپنے قانون کے مطابق، اپنے امر کے مطابق۔

میں نے شروع ہی میں عرض کیا، کہ اُس کا امر اور اُس کی مرضی یہ دو چیزیں نہیں ہیں، جس طرح خدا ایک ہے اِس

طرح اُس کا امر اور اُس کی مرضی ایک ہے دو نہیں ہے، تو خدا کی خوشنودی اُس کے امر میں ہم کو ملے گی اور یہ اندیشہ اُس وقت ہونا چاہیئے جب کہ کوئی دنیا کا بادشاہ اعلان کرے اور کہے کہ میری مرضی قانون سے اُوپر ہے، تو اُس میں کسی کو ڈر ہونا چاہیئے، کیا معلوم ہم کام کو اچھا بھی کریں گے تو بادشاہ اس میں نہیں چاہے گا، یہ دنیا کے کسی بادشاہ، دنیا کے کسی حاکم سے متعلق خوف پیدا ہو سکتا ہے لیکن جہاں خدا خود ہی یقین دلاتا ہے کہ دیکھو میری مرضی، میرے حکم میں ہے، تو ہمیں اِس میں کوئی خوف نہیں اور یہ بھی ہے اسی سلسلے میں کہ ایک آیت میں جو کچھ اعلان ہوتا ہے دوسری آیت میں اُس کی تصریح ہوتی ہے، اُس کی وضاحت ہوتی ہے، چنانچہ ''یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ'' کی وضاحت میں بہت ساری آیتیں ہیں، اُن کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کی خوشنودی ایسی ہے کہ ہم اپنی خوشنودی کو اُس کی خوشنودی میں فنا کریں، اپنی کوئی خواہش ہی نہ رکھیں، خدا کی مرضی کو اپنی مرضی بنائیں اُس کے فرامین کے توسّط سے، تو رفتہ رفتہ ہم کسی حد تک یہ کر سکتے ہیں اور پھر خدا کی رحمت و مہربانی سے اُس کی ہدایت ہمیں ایسی ملے گی جس کے نتیجے میں نور تک رسائی ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِس سوال کا صحیح جواب یہ ہے، شکریہ، اچھا سا سوال کیا۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: نجمہ بیگ　　نظرِ ثانی: اکبر علی　　پروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: قرآن میں بابِ صغیر کا تصوّر

کیسٹ نمبر: Q-30   تاریخ: ۷/اپریل/۱۹۸۳، کراچی

قرآنِ مقدّس جو مختلف علوم و حِکم کا سرچشمہ ہے، اُس میں علم کے اُصولات اور حکمت کی کلیدیں موجود ہیں، اُن اُصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے، کہ اِس خدا کی عزیز کتاب میں باب کا تصور یعنی دروازے کا تصور پایا جاتا ہے، اور یہ تصور بھی بڑا عجیب ہے کہ غور سے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کے وہاں ہر چیز کا دروازہ ہے، نہ صرف بہشت اور دوزخ کے دروازے ہیں بلکہ آسمان کے بھی دروازے ہیں، دین کے بھی دروازے ہیں، یہاں تک کہ خدا کا بھی دروازہ ہے، رسولؐ کا بھی دروازہ ہے اور امامؑ کا بھی، خدا کا دروازہ پیغمبر ﷺ ہیں کہ اُس کے بغیر یعنی اُس کی شناخت، اطاعت، فرمانبرداری اور محبّت کے بغیر کوئی شخص خدا تک رسا نہیں ہوسکتا ہے۔ یہ بات یہاں پر ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ رسولؐ کا بھی دروازہ ہے، کہ اِس دروازے کے بغیر کوئی فردِ بشر پیغمبرؐ کو جیسا کہ پانا چاہئے نہیں پا سکتا، اور وہ حضورؐ کا دروازہ مولانا مرتضیٰ علیؑ ہیں جو اساس ہیں، اور مولانا مرتضیٰ علیؑ کا دروازہ امامؑ ہیں یعنی حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ، اُن کا دروازہ حضرت امام زین العابدینؑ ہیں، اُن کا دروازہ حضرت امام محمد باقرؑ ہیں علیٰ ھذا القیاس، یہاں تک کہ اِن پاک و مقدّس اماموں کے سلسلے میں حاضر امامؑ ہیں جو امامت کے گیٹ ہیں۔ اِس لئے کہ اگر کوئی شخص زمانے کے امام سے انکار کرتا ہے، تو اُس پر امامت کا دروازہ بند ہوجاتا ہے اور جب امامت کا دروازہ بند ہوجاتا ہے، تو نبوّت کا راستہ، نبوّت کا دروازہ نہیں ملتا اور جس وقت نبوّت کا دروازہ نہیں ملتا تو اُلوہیت و ربوبیت یعنی خداوندی کا دروازہ بند رہتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص خدا کو مانتا ہے اور رسولؐ کو نہیں مانتا تو اُس کے لئے دینی طور پر کوئی فائدہ نہیں ملتا اور اگر کوئی شخص خدا اور رسول دونوں کو مانتا ہے اور مرتضیٰ علیؑ کو نہیں مانتا ہے تو اُس کے لئے حقیقتوں کا دروازہ بند ہے، اگر کوئی شخص خدا اور رسولؐ اور علیؑ کو مانتا ہے مگر بعد کے کسی امام کو نہیں مانتا ہے تا آنکہ زمانے کے امام تک تو اُس کو کوئی فائدہ نہیں۔ اِس لئے کہا گیا کہ خدا کا دروازہ رسولؐ ہیں اور رسولؐ کا دروازہ اساس جو خاص مرتبہ ہے امامت کا، اور اساس کا دروازہ یکے بعد دیگرے تمام اَئمہؑ ہیں۔

دوسرے اعتبار سے زمانے میں خدا کا دروازہ رسولؐ، رسولؐ کا دروازہ اساسؑ، اساسؑ کا دروازہ امامؑ، امامؑ کا دروازہ حجّت اور حجّت کا دروازہ داعی اور داعی کا دروازہ ماذون، اِسی طرح دین کا رستہ آگے بڑھتا ہے۔ جیسے قرآن میں درجات کا

ذکر ہے(۱۵:۴۰)اور وہ درجات یہی ہیں اور جیسے قرآن میں سیڑھیوں کا ذکر ہے(۷۰:۳)اور وہ سیڑھیاں یہی ہیں اور جیسے قرآن میں بابِ صغیر کا ذکر ہے(۷:۱۶۱) اُس کی اب ہم وضاحت سے بات کرنے والے ہیں،اور یہی ہیں دین کے دروازے کہ ایک دروازہ کھلتا ہے،رستہ ملتا ہے اور پھر دوسرا دروازہ کھلتا ہے،اور ابراہیمؑ کی مثال کو لیجئے کہ اُنہوں نے سب سے پہلے ستارے کو دیکھا جو حدودِ دین میں سے ایک تھا اور ستارے نے چاند تک پہنچا دیا، چاند نے اُن کو سورج کی طرف رہنمائی کی اور سورج نے آخری مقام تک پہنچایا(۶:۷۶۔۷۹) یہ حدودِ دین تھے۔دوسری طرف بابِ صغیر کی بات کرتے ہیں،کہ بابِ صغیر قرآنی تواریخ میں ایک حقیقت ہے،جس کا قرآن میں ذکر موجود ہے اور جس کا ظاہری پہلو اس طرح سے ہے کہ بنی اسرائیل سرکش ہوئے تھے،لہٰذا خداوندِ عالم نے حضرت موسیٰؑ سے ارشاد فرمایا کہ اے موسیٰ! یہ تو خوشی سے اطاعت اور سجدہ کرنے والے نہیں ہیں،اِس لئے شہر کا دروازہ اتنا چھوٹا بناؤ کہ اِس کے اندر اِن کو جھکتے ہوئے داخل ہوجانا پڑے تاکہ اِسی طرح کی ایک مجبوری کی اطاعت ہو۔چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک چھوٹا سا گیٹ کھڑا کیا کہ وہ بہت ہی پست تھا جس میں سے وہ لوگ جھک جھک کر داخل ہوجاتے تھے(۷:۱۶۱)۔مگر اِس کا مطلب یہاں پورا نہیں ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک تاویلی پس منظر رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بابِ صغیر ہر وقت لوگوں کے سامنے ہے،بابِ صغیر کا مطلب پیغمبرؐ کے بعد اساس ہیں اور اساس کے بعد امام اور امام کے بعد حجّت،کہ وہ حضرات جسمانیت کے اعتبار سے صغیر ہیں،لوگوں کی نظر میں اُن کی بشریت صغیر ہے اور جسمانی حدود کی اطاعت اُس وقت بجالائی جاسکتی ہے جب کہ کوئی شخص خود کو کمتر تصور کرے اور جھک جائے،تو وہ دروازہ اُس کو راستہ دے گا اور اگر کوئی شخص جھک نہیں جاتا اور اِسی طرح گردن اُٹھائے ہوئے اُس سے داخل ہوجانا چاہتا ہے تو سر اُس کا ٹوٹ جاتا ہے یا یہ کہ وہ داخل نہیں ہوسکتا۔یہ اشارہ ہے کہ حدودِ جسمانی جو خدا کی طرف سے مقرّر ہیں،اُن کے سامنے بندۂ مومن خود کو حقیر،کمتر اور فنا سمجھے،اُن کی بشریت و جسمانیت کے سامنے جھک جائے اور جھکنے کی تاویل اطاعت و فرمانبرداری ہے،تب اُس کو کوئی راستہ ملے گا۔

آج دنیا میں بہت سے لوگ خدا کے رسول کو نہیں مانتے ہیں،تب ہی تو وہ خدا تک رسا نہیں ہوسکتے اور کچھ لوگ رسولؐ کو مانتے ہیں،کہ رسول کے گیٹ کو نہیں مانتے،وہ لوگ بھی خدا اور رسول تک نہیں پہنچ سکتے اور کچھ لوگ ہیں کہ رسول کے گیٹ کو مانتے ہیں لیکن بعد کے گیٹوں کو نہیں مانتے ہیں،اِس سے کوئی فائدہ نہیں ملتا،ترتیب اور اُصول یوں ہونا چاہئے کہ جو سامنے گیٹ ہے اُس سے داخل ہوجانا شروع کیا جائے،اور یہی وجہ ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے سارے علم کو امامِ زمانہ سے وابستہ بتایا ہے کہ:"مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِهٖ مَاتَ مَیْتَةً جَاهِلِیَّةً وَالْجَاهِلُ فِي النَّارِ"اور جو اپنے وقت کے امام کو نہیں پہچانتا،تو وقت سے پہلے جاہلیت کی موت مر چکا ہوتا ہے اور ایسا شخص نار میں ہے یعنی آگ میں ہے۔اب آپ سوچیں کہ جو امام کو نہیں پہچانتا ہے وہ کیوں جہالت کی موت مر چکا ہوتا ہے؟ دانشمند کے لئے اِس کا

مطلب واضح ہے کہ سارا علم، ساری حکمت و دانائی امام کے ساتھ ہے اور ساری جہالت و نادانی امام کے سمت مخالف میں ہے اور امام کو پہچانا یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ لفظوں میں معنی ہوتے ہیں، لفظوں میں حکمت ہوتی ہے یعنی اُن لفظوں میں جو خدا کے ہیں اور رسول کے ہیں، تو یہ رسولؐ کی حدیث ہے اِس لئے اِس میں بہت بڑی حکمت ہے۔ رسولؐ کے کلام میں اور خدا کے کلام میں ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو کوئی فرق نہیں ہے، صرف ایک فرق ہے کہ خدا کا کلام قرآن کی حدود میں ہے اور رسولؐ کا کلام اِس سے باہر ہے یہ فرق ہے، اور جس معنیٰ میں فرق نہیں اُس کا ایک ثبوت قرآن سے ملتا ہے: ''وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ'' (۵۳:۳) وہ اپنے نفس کے خواہش سے نہیں بولا کرتا، اُس میں بولنے کے لئے خدائی طاقتیں کارفرما ہیں۔ جس طرح ایک مومن کے اختیار میں سے بہت کچھ کم ہوتا ہے جب کہ خدا کی طرف سے اِس کو توفیقات، تائیدات آنے لگتی ہیں، تو بندۂ مومن کا اپنا اختیار کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے، یہ تو ایک مومن کی بات ہوئی اور رسولؐ اِس سلسلے کی چوٹی پر ہیں، رسولؐ وہ ہستی ہیں جس پر تائیدات و توفیقات، ہدایت و الہامات اور وحی کی بارش ہوتی رہتی تھی، لہٰذا اُن کا اپنا اختیار کہاں ہوتا ہے، کہ وہ اپنے اختیار سے کچھ بولیں، اُن میں تو خدا بولتا ہے، خدا کلام کرتا ہے اور رسول توکُّل کے اعلیٰ مقام پر ہوتے ہیں اور توکُّل کیا ہے؟ توکُّل خدا کی کارسازی کا، خدا کے کام کرنے کا، خدا کے وکیل بن جانے کا نام ہے، یہ بندۂ مومن کے اختیار میں رہنے کی بات ہے اور خاص کر رسول کا اختیار، تو رسول کا کلام خدا کا کلام ہوتا ہے اِس لئے یہ جو حدیث ہے صحیح حدیث ہے۔

آپ تو یہ بات جان چکے ہیں کہ تعریف صحیح حدیث کی ہے، جو جعلی اور بناوٹی حدیث ہے اُس کی کوئی تعریف نہیں ہے، وہ تو کسی شخص کا بنا بنایا قول ہوتا ہے، اُس سے تو گمراہی ہوتی ہے، ہدایت نہیں ہوتی، تو یہ صحیح حدیث ہے کہ جس نے اپنے وقت کے امام کو نہیں پہچانا تو وہ جاہلانہ موت مر چکا ہوتا ہے اور اُس کا ٹھکانہ آتش دوزخ ہے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ علوم کا یعنی دینی اور خدائی علوم کا سرچشمہ امامؑ ہیں، [یہ] کس معنیٰ میں اور کس (sense) میں؟ اِس (sense) میں کہ وہ دروازہ ہیں رسولؐ کے، اور رسولؐ دروازہ ہیں خدا کے اور خدا علم وحکمت کا خزانہ ہے۔ اِس تصور سے بڑی سختی کے ساتھ خدائی علوم پر پابندی لگ جاتی ہے اور ایک ایسا تصور ملتا ہے، کہ رسولؐ نے اپنے زمانے میں حقیقی علم کے موتی بکھیر نہیں دیئے، اُنہوں نے زمانے میں نیکی کی ہدایت کی لیکن اسرارِ خداوندی کو خزانے کے طور پر رکھا اور وہ امامؑ کے سپرد کر دیا ورنہ یہ تصور قائم نہیں رہ سکتا۔ میرا مطلب ہے کہ اگر مان لیا جائے کہ رسولِ اکرمؐ نے اپنے وقت میں خدائی علم کے خزانے لٹا دیئے اور کوئی بات باقی نہیں رہی قیامت تک تمام واقعات حالات لوگوں کے سامنے لائے اور آسمانی خزانے مختلف طریقوں سے بکھیر کے رکھ دیئے، اور اگر اِس مفروضہ کو تسلیم کریں تو پھر قرآن کا وجود بیکار ہو جاتا ہے، اور دوست اور دشمن کا کوئی فرق باقی نہیں رہتا اور جو حقدار ہے اور جس کا حق نہیں، اُس میں بھی کوئی فرق باقی نہیں رہتا اور علم کے لئے جو شرط ہے یا جو تقویٰ ہے اُس کی بھی ضرورت نہیں ہوتی ہے، کہ اگر دنیا میں خزانے (open) ہیں تو ہر کوئی اُس کو حاصل کرے گا یہ بات نہیں

ہے۔ اِس تصور کا کہ رسولؐ علم کا شہر ہے اور علیؑ اُس کا دروازہ ہے، نیز رسول حکمت کا گھر ہے اور علیؑ اُس کا دروازہ ہے، اِس تصور کا قیام اِس بات پر ہے کہ ہمیشہ یہ شہر اور یہ گھر اِس طرح سے قائم و باقی ہے اور جس کی وجہ سے لوگوں کے دو گروہ بنتے ہیں، ایک وہ جو اِس دروازے کو نہیں جانتے ہیں اُس کی طرف توجہ نہیں دیتے ہیں، دوسرے وہ جو اِس دروازے سے داخل ہوجاتے ہیں۔ اِس صورت میں حقیقی علم کا وجود اِس شہر کے باہر اور اِس گھر کے باہر کہیں بھی نہیں ملتا ہے، کیونکہ رسولؐ نے اِس شہر کو اور اِس گھر کو ویران نہیں کیا اِس کو آباد کیا، اِس کے اُصولات کو قائم کیا، اِس کے قوانین کو بتایا اور دائمی طور پر یہ تصور لوگوں کے سامنے رکھا اور دائمی طور پر یہ تصور لوگوں کے سامنے رکھا۔ پھر کوئی حقیقی علم اِس شہر کے باہر اور اِس گھر کے سوا کیسے ہوسکتا ہے، جو اگر ہم مانیں کہ اِس شہر کے باہر اور اِس گھر کے سوا کہیں بھی خدا کا علم نہیں ہے، تو اِس کا ایک لازمی (result) یہ سامنے آیا کہ اصل میں رسولؐ نے علم کے خزانے نہیں لٹائے تھے۔ اُنہوں نے ایک قانون کے تحت، ایک اُصول کے مطابق لوگوں کو ضروری ہدایت دی تھی اور اُن کے زمانے کے مطابق اُن کو ہدایت دی تھی اور باقی زمانے کے مطابق جو کچھ ہونا چاہئے مستقل اور تدریجی ہدایت کی ذمّہ داری امام کو سونپی تھی۔

یہ بات اِس لئے کہی گئی کہ اگر رسولؐ نے علم کے جواہرات لٹائے ہوتے، تو وہ جواہرات لوگوں کے پاس ہوتے اور علیؑ کے بغیر، امام کے بغیر اِن جواہرات کو لوگ استعمال کرتے اور اپنے ہم مذہب والوں کو، ہم عصر والوں کو یہ موتی، یہ جواہرات، یہ خزانے دے دیتے پھر سوال پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص کس طرح امام کے بغیر جاہل رہ سکتا ہے؟ تو میں نے قولِ رسولؐ کی تعریف کی کہ وہ خدا کے قول کی طرح ہے اور آپ غور سے دیکھیں اسلامی کُتب کا مطالعہ کریں اور اُن کُتب کا مطالعہ کریں جن سے حدیثوں کی پہچان ہوتی ہے یا حدیثوں کے سلسلے میں یا حدیثِ رسول کی اہمیت کے بارے میں بات بتائی جاتی ہے، تو آپ کو اِس کا علم ہوجائے گا اور اِس اہمیت کے ساتھ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے، کہ امام علم کا مرکز ہے، رُوحانی علم کا، خدائی علم، حقیقی علم کا اور جو اُس کے سوا ہیں وہ جاہل ہیں۔ جاہل دینی علم سے، جاہل حقیقی علم سے، جاہل خدائی علم، جاہل رُوحانی علم سے، جاہل رُوح کی شناخت سے، خدا کی شناخت سے، پیغمبر اور امام کی شناخت سے، اپنی ذات کی شناخت سے جاہل، دنیا کی کسب سے جاہل نہیں اور علم کے لغوی معنی ہیں جاننا۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جاننا؟ دنیا کے کاموں کو جاننا؟ نہیں! خدا کے بھیدوں کو جاننا، دین کو جاننا، آخرت کو جاننا، رُوح کو جاننا، حقیقت کو جاننا اور جن چیزوں کو جاننا چاہئے اُن کو جاننا، یہ علم ہے، علم کی (definition) ہے۔ اگر کوئی شخص علم کی (definition) غلط بتائے، تو یہ بات صحیح نہیں اِس لئے کہ دنیا میں لوگ جو چاہیں، تو جہالت کا نام علم کرسکتے ہیں، گمراہی کو ہدایت کہہ سکتے ہیں، یہ بات ایسی ہوئی جیسے کوئی دن کو رات کہتا ہے اور رات کو دن، کوئی چاہے کہہ سکتا ہے، کوئی انکار کرنا چاہے کرسکتا ہے اُس کے لئے کوئی علاج نہیں ہے۔ چنانچہ یہی ہو رہا ہے، کہ دنیا میں بہت سے لوگ جہالت کو علم تصور کرتے ہیں اور جہالت کو سجا سجا کر علم کے نام سے پیش کر رہے ہیں،

گمراہی کو ہدایت کے عنوان سے استعمال کر رہے ہیں اور غلط رستے کو صراطِ مستقیم خیال کرتے ہیں، جو غیر امام ہے اُس کو امام مانتے ہیں، تو قرآن میں جا کر دیکھیں کہ کچھ لوگ شیطان کو اپنا دوست بنا رہے ہیں خدا کے کہنے کے مطابق قرآن کے بموجب بہت سے لوگ شیطان کو اپنا دوست بنا رہے ہیں (۳:۲۲) لیکن ظاہر میں جا کر دیکھیں ہر فرقے میں جا کر دیکھیں، مذاہبِ عالم کا مطالعہ کر کے دیکھیں کہ کوئی فرقہ ایسا نہیں ہے، کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو شیطان کو گالیاں نہیں دیتا ہو، لیکن یہ کیا بات ہے؟ اُدھر خدا کہتا ہے کہ بہت سے شیطان کو دوست بنا رہے ہیں، اِدھر یہ حال ہے کہ ہر شخص کو شیطان سے نفرت ہے، اب ہم اِس کو کس طرح سمجھیں؟ کون لوگ ہیں، کونسا فرقہ ہے، کونسا مذہب ہے جو شیطان کو اپنا دوست مان رہا ہے۔

بات دراصل اِس طرح سے ہے، کہ لوگ ناسمجھی میں اور لاشعوری طور پر شیطان کو اپنا دوست بنا رہے ہیں، جس کو وہ پیشوا مانتے ہیں، جس کو وہ ولی مانتے ہیں، جس کو وہ بزرگ قرار دیتے ہیں وہ ہے شیطان، اور اِس کے سوا اِس مفہوم کا کوئی مطلب نہیں ہے جس میں فرمایا گیا ہے، کہ وہ لوگ شیطان کو اپنا دوست، ولی، آقا مان رہے ہیں، تو اِس لئے میں نے کہا کہ دنیا میں بہت سے لوگ جہالت کا نام علم بتاتے ہیں اور تاریکی کو روشنی سمجھ رہے ہیں اور باطل کو حق تصور کرتے ہیں، یہ سب کچھ اِس لئے ہے کہ انسان کی اپنی جزوی عقل راہِ خدا کے جاننے کے لئے کافی نہیں ہے۔ کوئی شخص راہِ مستقیم سے بھٹک جاتا ہے تو اِس خیال سے بھٹک جاتا ہے کہ شاید وہ جس سمت کو جا رہا ہے صراطِ مستقیم اُس طرف ہے، آپ دنیا کے تمام مذاہب سے پوچھیں، اُن میں سے ہر ایک کہے گا کہ وہ حق پر ہے، کوئی نہیں کہے گا کہ وہ غلطی پر ہے، یہود سے جا کر پوچھیں، نصاریٰ سے پوچھیں، ہندو سے پوچھیں، زرتشت سے پوچھیں، (buddhist) سے پوچھیں اور دوسرے مذاہب دنیا میں بڑے چھوٹے جتنے بھی ہیں کوئی نہیں مانے گا، کہ اُس کا رستہ کھو گیا، کوئی نہیں مانے گا، تو اِس کو کوئی نہیں سمجھے گا خدا، رسول اور امام کے سوا یعنی جو تاریکی میں ہیں وہ نہ تو خود کو پہچانیں گے اور نہ دوسروں کو یعنی جو تاریکی میں ہیں وہ اپنے رستے کی تعریف نہیں کر سکیں گے وہ نہیں بتا سکیں گی کہ کیا ہے اور دوسروں کو بھی نہیں سمجھیں گے۔ مگر ہاں! جو صراطِ مستقیم پر ہیں وہ خدا و رسول اور امام کے بعد وہ کچھ فرق کر سکیں گے، وہ کچھ بتا سکیں گے کیونکہ اُن کے پاس روشنی ہے، وہ (realize) کر سکیں گے، وہ اِس طرح حقیقت بیان کر سکیں گے، کہ اُن کے پاس جو علم ہے جو حقیقت ہے وہ اُس کو بیان کر سکیں گے اور اِس کے سوا دنیا میں کوئی شخص، کوئی گروہ یہ نہیں بتا سکتا ہے کہ حقیقت کیا ہے، وہ حقیقت سے دُور ہے، ناآشنا ہے اور حقیقت سے کھویا ہوا ہے تو وہ نہیں بتا سکیں گے۔

یہ بات ہے کہ ہر چیز کا دروازہ ہوا کرتا ہے اور دین میں اِس تصور کے باہر کوئی چیز نہیں ہے، تو ہمیں شکر گزار ہونا چاہئے کہ ہمیں خدا کی رسّی ملی ہے اور ہم اِسی رسّی سے وابستہ ہیں، اِسی رسّی کو تھامے ہوئے ہیں اور یہی رسّی، یعنی امامت گیٹ ہے نبوّت کا، اور نبوّت گیٹ ہے خداوندی کا، اور میں نے کبھی یہ بھی بتایا تھا کہ خدا کے لئے اقرار مشکل نہیں ہے رسولؐ کے

لئے اقرار مشکل ہے، اور رسولؐ کے لئے اقرار مشکل نہیں ہے اساس کے لئے اقرار مشکل ہے، اور اساس کے لئے اقرار مشکل نہیں ہے چونکہ وہ زمانۂ نبوّت میں مشہور ہیں، اُس کو کون نہیں مانتا ہے، اساس کے بعد کے سلسلے میں ہر امام کے لئے اقرار مشکل ہے اور سب سے بڑی مشکل زمانے کے امام کو ماننا ہے، یہ بابِ صغیر ہے۔ "وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ" (۵۸:۲) زمانے کے امام وہ بابِ صغیر ہیں جو خدا کے حکم سے قائم کیا گیا ہے، اِس دروازے سے جھک کر داخل ہو جانا ہے، اور آج کی کلاس بس اتنی ہو گی اور باقی جو کچھ سوال ہے ابھی بھی آپ کر سکتے ہیں اور آج کے لئے اتنا کافی ہے، شکریہ کہ آپ نے بہت توجہ دی اور بڑے شوق سے لکھا، شکریہ۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپنگ: اکبر علی　　　　پروف: نسرین اکبر